ماہنامہ

مئی 2023ء

طلوعِ اسلام

لاہور

اشاعت کا اِسی واں سال

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ (الحدیث)

حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائد اعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

اس شمارے میں:

- قرآنی برادری سے چند گذارشات 4
- سورۃ الفاتحہ (تمہید) 6
- سرمایہ ومحنت 28
- قرآن کا تصورِ حکومت 29
- قرآن اور ہمارا سفر 50
- نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے' کرنے والے میں 54
- عربی محاورے 57
- The Human Self and Allah 60

محنت کشوں کو سلام!

یکم مئی 2023

مزدور کا دن

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مذہب اور دینِ اسلام کا تقابلی جائزہ

یورپ نے غالباً مانی کے عقیدے سے روح کو مادہ کی ثنویت کا خیال اخذ کیا اور بلاتنقید اسے قبول کرلیا۔ اسی نظریہ کی بنیاد پر انہوں نے مذہب (Religion) اور سیاست (State) کی ثنویت کا تصور پیش کیا۔ قرآنِ کریم میں مذہب کا لفظ ہی کہیں نہیں آیا۔ اس لئے اسلام کو مذہب نہیں بلکہ قرآن کے دیئے ہوئے دین کے نام سے پکارنا چاہئے۔ اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ (3:19)-

مذہب	دینِ اسلام
1- مذہب، خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق اور داخلی تجربہ کا نام ہے۔	دین اجتماعی نظامِ زندگی اور خارجی حقیقت ہے۔
2- مذہب میں ہر فرد اپنے طور پر مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس کا خدا کے ساتھ رشتہ قائم ہو گیا ہے۔	دین میں معاشرہ کا انداز اور آئین بتا سکتے ہیں کہ وہ قوانین خداوندی کے مطابق متشکل ہوا ہے یا نہیں۔
3- مذہب میں ہر فرد کا منتہیٰ اپنی اپنی نجات ہوتا ہے۔	دین کا مقصود عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود ہوتا ہے۔
4- مذہب میں کوئی خارجی معیار ایسا نہیں ہوتا جس سے پرکھا جا سکے کہ انسان کے اعمال صحیح نتائج پیدا کر رہے ہیں یا نہیں۔	دین میں اجتماعی زندگی کے نتائج ساتھ کے ساتھ بتاتے چلے جاتے ہیں کہ ملت صحیح راستے پر چل رہی ہے یا نہیں۔
5- مذہب انسان کو مختلف فرقوں میں تقسیم کر دیتا ہے اور اس میں ہر فرقہ اپنے آپ کو حق پر سمجھ کر خوش ہوتا ہے۔	دین میں تفرقہ کو شرک کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ پوری نوع انسانی سے مخاطب اور اس کا رب، رب العالمین اور رسول رحمۃ للعالمین کا مقام رکھتے ہیں۔
6- مذہب عوام کے جذبات کے پیچھے چلتا ہے اور ان کی تسکین کا سامان فراہم کئے چلا جاتا ہے۔ اس لئے اس کی تعلیم یہ ہے۔ زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز	دین، انہیں حقائق کے پیچھے چلاتا ہے اور ان کے سطحی جذبات کی تسکین کی بجائے ان پر قابو پانے کی تعلیم یوں دیتا ہے۔ زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز
7- مذہب انسان کے دل میں ہر وقت خوف پیدا کرتا رہتا ہے اور اپنی ہر بات ڈر سے منواتا ہے۔	دین خوف کو شرک قرار دیتا ہے اور انسان کے دل کو جرأت اور بے باکی کا مسکن بناتا ہے۔

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور
مئی 2023ء
جلد 76 شمارہ نمبر 05

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر اعجاز رسول
اقبال ادریس ایڈووکیٹ

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 600 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: قرآنی برادری سے چند گذارشات	ادارہ	4
سورۃ الفاتحہ (تمہید)	درسِ قرآن	6
سرمایہ و محنت	علامہ محمد اقبالؒ	28
قرآن کا تصورِ حکومت (گذشتہ سے پیوستہ)	پرویز علیہ الرحمۃ	29
قرآن اور ہمارا سفر	خورشید انور، سوات	50
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں	آصف جلیل، کراچی	54
عربی محاورے	شیخ محمد عقیل حیدر، فیصل آباد	57

ENGLISH SECTION

The Human Self and Allah By G. A. Parwez (Translated by: Dr. Ejaz Rasool) Episode No. 16	59

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: +92 310-4800818
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions	For International Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672	IBAN:PK36NBPA0465004073177672 Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا!
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے
حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبع بلندے، مشربِ نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

(بانگِ درا۔علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

قرآنی برادری سے چند گذارشات

اس وقت ساری دنیا، اپنے اپنے غلط نظامہائے زندگی کے انسانیت سوز نتائج وعواقب سے تنگ آ کر، ایک نئے نظام کی تلاش میں، مضطرب و بے قرار پھر رہی ہے۔ چونکہ ان اقوامِ عالم کے سامنے وحی کی روشنی نہیں اس لئے وہ اپنے ظن وتخمین کی وادیوں میں اندھوں کی طرح ہاتھ پاؤں مار رہی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی کا سر پھٹتا ہے، کسی کی ہڈی پسلی ٹوٹتی ہے۔ کسی کو معلوم نہیں کہ اگلی لاٹھی کدھر سے اٹھے گی اور کس کے جا لگے گی۔ دنیا میں، اس سے قبل، شاید ہی کوئی دور ایسا آیا ہو جس میں پوری کی پوری انسانیت، اپنے بنائے ہوئے زندان سے نکلنے کے لئے اس طرح تڑپ رہی ہو۔ غور کیجئے کہ ان حالات میں، اس قوم پر جسے وراثتِ کتاب کے لئے منتخب کیا گیا تھا اور جسے ضابطۂ قوانینِ خداوندی کا امین بنایا گیا تھا، کتنی بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے لیکن اس قوم کی حالت یہ ہے کہ وہ خدا کے عطا فرمودہ جگمگاتے ہوئے چراغ کو تہِ دامن چھپائے بیٹھی ہے اور اس طرح خود بھی اس کی روشنی سے محروم ہے اور باقی دنیا کو بھی اندھیرے میں رکھے ہوئے ہے۔ اگر اسے تعلّی پر محمول نہ کیا جائے (بلکہ تحدیث نعمت سمجھا جائے) تو یہ کہنے میں قطعاً باک نہیں کہ اس وقت ساری دنیا میں صرف طلوعِ اسلام اس آواز کو بلند کر رہا ہے کہ اس ''ید بیضا'' کو پھر سے آستین سے باہر نکال کر دنیا کو بقعۂ نور بنا دو تا کہ اسکی روشنی میں تم بھی جانب منزل جادہ پیما ہو سکو اور تمہارے پیچھے پیچھے باقی دنیا بھی امن و عافیت کی جنت کی طرف گامزن ہو جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ آواز اس وقت بڑی کمزور ہے اور اس کا حلقہ بڑا محدود۔ لیکن اسے صورِ قیامت بنا دینا کچھ بھی مشکل نہیں۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہ آواز فی الواقعہ حق اور صداقت کی آواز ہے تو اسے نشید کامرانی بنانے میں جو مدد بھی آپ کر سکیں گے وہ قرآنی نظام کے قیام کی راہ میں ایک قدم آگے بڑھانے کے مرادف ہوگا۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے قطرے، دریا بن جاتے ہیں اور افراد، کارواں کی صورت اختیار کر کے، راستہ کی پرخطر گھاٹیوں سے محفوظ و مصئون، جانبِ منزل رواں دواں بڑھے چلے جاتے ہیں۔ ہم افراد سے زیادہ،

ان اداروں کی توجہ بھی اس نقطہ کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں' جو قرآنی نظام کی تشکیل کو اپنا مطمحِ نگاہ سمجھتے ہیں' کہ اگر آپ اس سے متفق ہیں کہ طلوعِ اسلام کا قدم صحیح راہ پر اٹھ رہا ہے' تو الگ الگ' منتشر کوششوں کی بجائے' وہ اسی کو اپنی سعی و عمل کا مظہر کیوں نہ بنالیں؟ اس سے' اس منزل کی طرف جانے والے تمام افراد کے لئے وحدتِ مرکز اور ہم آہنگیٔ فکر و عمل پیدا ہو جائے گی جو نظامِ قرآنی کے لئے اصل و بنیاد ہے۔ ابتداءً نیتیں کتنی ہی نیک اور دل کیسے ہی پرخلوص کیوں نہ ہوں' الگ الگ مراکز سے' آگے چل کر' الگ الگ فرقے بن جانے کا خدشہ ہوتا ہے۔ طلوعِ اسلام کوئی تجارتی ادارہ نہیں۔ اس لئے یہ' قرآنی نگاہ رکھنے والے تمام افرادِ ملت کے خیالات کا ترجمان ہے۔ بنا بریں' اس نہج کے لکھنے والے اسی میں لکھیں اور ان خیالات کو پھیلانے کا جذبہ رکھنے والے' اسی کو پھیلائیں۔ اس سے اس قرآن برادری کے افراد' تشتتِ فکر و نظر اور انتشارِ سعی و عمل سے بچ جائیں گے۔

بہرکیف' افراد ہوں یا ادارے' جو بھی طلوعِ اسلام کے مقصد سے متفق ہوں' ان کی ہر کوشش' اس آواز کو آگے بڑھانے کا موجب اور اس تحریک کی تقویت کا باعث ہوگی۔ اس باب میں ہمیں زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ جو اسے اپنا فریضۂ حیات سمجھتا ہے وہ از خود اس میں شرکت کرے گا۔ جو ایسا نہیں سمجھتا' اس سے کچھ کہنا بیکار ہے۔ بیکار ہی نہیں بلکہ اس کی کوئی امداد (جو بہرحال طوعاً نہیں بلکہ کرہاً ہوگی) اس تحریک کی راہ میں الٹا روڑا بن کر اٹک جائے گی' جس طرح مجبوراً ساتھ چلنے والے کا ساتھ' ہمرہانِ سفر کے لئے زنجیرِ پا بن جایا کرتا ہے۔ بطیب خاطر چلنے والے آئیں اور راہ نوردانِ شوق کے اس قافلے میں شامل ہو جائیں جو سر میں سودائے عشق' دل میں ذوقِ تجسس' نگاہوں میں کیفِ آرزو اور ہاتھ میں قندیلِ قرآنی لئے' ستاروں کی سی خاموشی اور نرم روی سے' بے ساز و یراق جانبِ منزل بڑھے چلا جا رہا ہے۔ زادِ راہ کی کمی' مخالفتوں کا ہجوم' حالات کی نامساعدت چھلاوے بن بن کر ڈرا رہی ہے لیکن افق کے اُس پار سے آنے والی ایک بے صوت صدا ہے جو نغمۂ جبریل کی طرح یہ کہتی ہوئی دل کی گہرائیوں میں اترتی جا رہی ہے کہ:

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۝۳۰ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ۝۳۱ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ۝۳۲ وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۝۳۳ (41:30-33)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

درسِ قرآن

سورۃ الفاتحہ (تمہید)

آغازِ سخن بسلسلۂ درس قرآنِ حکیم کراچی 1950ء

عزیزانِ من! یہ پرویز کی آواز ہے۔ میں اپنے مکان B/25، گلبرگ 2، لاہور، پاکستان، سے بول رہا ہوں۔ آج اکتوبر 1979 کی 14 تاریخ ہے۔ میں آپ احباب سے مخاطب ہو رہا ہوں، اس کے متعلق اتنا عرض کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ میں قرآنِ کریم کا ایک ادنیٰ سا طالب علم ہوں۔ میں نے اپنی پوری زندگی اس کتابِ عظیم کے سمجھنے اور سمجھانے میں بسر کی ہے۔ پہلے عام مروجہ تراجم کے انداز سے، اس کتاب کو سمجھنے کی کوشش کی، لیکن اس سے کچھ بات سمجھ میں نہ آئی، تو میں نے پھر اس انداز سے کہ جس میں خود اس کتاب نے اپنے متعلق کہا ہے کہ اس کو سمجھا جائے، اس کے سمجھنے کی کوشش کی۔ قریب پچاس سال سے میں اس کوشش میں مصروف ہوں۔ [1] اس کے سمجھنے کے بعد مجھ پر یہ فریضہ عائد ہو گیا کہ: ''دیکھا ہے جو کچھ میں نے، اوروں کو بھی دکھلا دوں''۔

یہ فرمانِ خداوندی ہے۔ نبی اکرم ﷺ سے فرمایا گیا تھا کہ بَلِّغۡ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ (5:67) خدا کی طرف سے جو تجھ پر نازل کیا جاتا ہے، اسے دوسروں تک بھی پہنچا دے۔ خدا کی طرف سے ان کا یہ نازل ہونا، نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی پر ختم ہو گیا لیکن قرآن کے نزول کے بعد یہ زندۂ جاوید کتاب قرآن کریم قیامت تک رہے گی۔ یہی فریضہ ہر اس شخص پر عائد ہو جاتا ہے جو قرآنِ کریم کو سمجھے اور دوسروں تک بھی پہنچائے۔

اس فریضہ کی ادائیگی کا آغاز تو میں نے اس سے بہت پہلے، دہلی اور شملہ میں، متفرق خطابات سے کر رکھا تھا، لیکن پاکستان بننے کے بعد قرآن کے درس کا سلسلہ میں نے کراچی میں 1950 میں، شروع کیا۔ اس وقت قرآن کا یہ درس مسلسل نہیں تھا، مختلف موضوعات سامنے آتے تھے اور ہر موضوع کے متعلق قرآنِ کریم میں جو کچھ آیا ہے اپنی بصیرت کے مطابق میں اسے سامعین کے سامنے پیش کرتا تھا۔ یہ سلسلہ 1958 تک رہا جب تک میں کراچی میں رہا۔

---

[1] اکتوبر 1979ء میں پرویز صاحب دروس قرآن کے دوسرے دور میں سورۃ لقمان تک پہنچ گئے تھے۔ ان ایام میں باہر کے احباب جو سورۃ الفاتحہ کے دروس پہلے دور کی کیسٹس کے ذریعہ سنا کرتے تھے، ان کا تقاضا تھا کہ پرویز صاحب اپنی آواز میں سورۃ الفاتحہ کے دروس کو دوبارہ ریکارڈ کروا دیں کیونکہ کیسٹس کی آواز کی کوالٹی میں کافی فرق پڑ گیا تھا۔ اس طرح پرویز صاحب نے دوبارہ سورۃ الفاتحہ کے دروس ریکارڈ کرائے اور چونکہ 1968ء کے بعد 1979ء تک ان کے فہم و بصیرتِ قرآن میں بھی اضافہ ہو گیا تھا اس لیے موجودہ دروس کی تعداد نو ہے جب کہ پہلے دور کے دروس قرآن کی تعداد آٹھ تھی۔

لاہور میں ہفتہ وار درسِ قرآنِ حکیم کا آغاز

جب میں 1958ء میں کراچی سے منتقل ہو کر لاہور آیا تو اسی سال یعنی 1958 میں، میں نے درسِ قرآنِ کریم کا سلسلہ یہاں، خود اپنے مکان پر، جاری رکھا۔ یہ ہفتہ واری درس تھا۔ چونکہ اس زمانے میں دفاتر وغیرہ میں چھٹی اتوار کے دن ہوتی تھی، اس لیے یہ درس اتوار کی صبح کو میرے مکان پر ہوا کرتا تھا۔ 1958ء سے لے کر 1967ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ جب اس پورے قرآنِ کریم کے پہلے سلسلہ درس کا اختتام ہوا، تو اسی اختتام کے ساتھ ہی یہ تقاضا شروع ہوا کہ مجھے ازسرِنو اس سلسلے کو جاری کرنا چاہیے کیونکہ اس دوران میں بہت سے ایسے احباب درس کے حلقے میں شامل ہو گئے تھے جو پہلے دَور میں یا شروع میں شامل نہیں تھے یا بعد میں یا درمیان میں، آ کر اس پچھلے وقت کے لیے شامل نہ رہے۔ بہرحال ان سامعین کا تقاضا تھا کہ درس کا سلسلہ پھر شروع کیا جائے چنانچہ 17 مارچ 1968ء [1] میں یہ سلسلہ ازسرنو شروع کیا گیا۔ مسلسل درسِ قرآن کریم اس زمانے سے آج تک ہر اتوار کی صبح کو یہاں ہوتا آ رہا ہے اور اب جیسا میں نے عرض کیا ہے اکتوبر 1979 میں ہم سورۃ لقمان اکتیسویں سورۃ تک پہنچ پائے ہیں۔

قرآنِ کریم کا یہ درس یہاں قارئین تو بالمشافہ سنتے ہیں لیکن باہر کے احباب کے لیے اسے ٹیپس پر محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ ٹیپس کے بعد جب کیسٹس کا سلسلہ جاری ہوا تو پھر اسے کیسٹس پر بھی منتقل کیا گیا اور اس طرح یہ درس مقامی نہ رہا، بلکہ پہلے پاکستان کے مختلف شہروں میں اس کا رواج ہوا اور اس کے بعد پاکستان کے باہر بھی مختلف مقامات پر مستقلاً بھی، انتظاماً بھی، اور صبح صبح بھی، بہت سے احباب نے اپنے ہاں کیا، بزموں نے بھی اس سلسلے کو مسلسل اپنے ہاں جاری رکھا اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے یہ سلسلہ نہ صرف یہ کہ اس وقت رواں دواں جاری ہے بلکہ یہ حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے اور میں اللہ تعالیٰ کے اس کرمِ بے پایاں پر جس قدر بھی اظہارِ تشکر کروں کم ہے۔

اس سلسلہ نو کی ابتداء جیسا کہ ظاہر ہے سورۃ الفاتحہ سے ہی ہونی تھی چنانچہ اس سورۃ کی تکمیل آٹھ درسوں میں، علاوہ اس تمہیدی درس کے ہوئی، احباب نے اپنی اپنی جگہ اس کو بڑی ہی کثرت اور وسعت سے پھیلایا اور اس کا اظہار بھی متعدد مقامات پر کیا۔ ان کا تاثر یہ ہے کہ اگر اسے دل کے کانوں سے سن لیا جائے تو قرآنِ کریم اکثر و بیشتر پورے طور پر سمجھ میں آ جاتا ہے یا کم از کم دین کی تعلیمات، اقوال، اسلام کے بنیادی نظریات، قواعد، اور پیام، انسان کے سامنے آ جاتا ہے۔ اس لیے اس درس کے یہ کیسٹس عام طور پر مختلف مقامات پر بہت زیادہ سنائے گئے اور سنائے جاتے رہے ہیں۔ بعض مقامات سے اطلاع آئی کہ ان

---

[1] سامعین درس (اوّل) کا اصرار تھا کہ محترم پرویزؒ اپنے اس درس کا دوسرا دَور شروع کر دیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس قسم کے طویل وعریض پروگرام کو التزاماً جاری رکھنا بڑا صبر آزما مرحلہ ہوتا ہے۔ انہوں نے احباب کے اس تقاضائے شوق کے سامنے سرِتسلیم خم کر دیا لیکن اپنی صحت کی بحالی کے لیے صرف دو ماہ کے وقفہ کی ''درخواست کی''، جس پر احباب نے بادلِ ناخواستہ رضامندی کا اظہار کیا۔ چنانچہ اب اس درس کا ازسرِنو سلسلہ وسط مارچ سے شروع کیا جائے گا۔
(حوالہ: طلوعِ اسلام فروری 1968ء، ص 8 (ایک خصوصی اعلان) نیز مجلہ طلوعِ اسلام اپریل 1968ء، ص 17)

کے پرانے ہونے کی وجہ سے اُن کی آواز کچھ تھوڑی سی مفقود ہو گئی ہے۔ضرورت ہے کہ میں ان درسوں کو یعنی سورۃ فاتحہ کی تفسیر کو ٬جو میں نے درسوں میں بیان کی تھی٬ اب ازسرِ نو ریکارڈ کردوں تا کہ آواز میں جو کھنگی پیدا ہو گئی تھی٬ وہ دور ہو جائے۔

سورۃ فاتحہ کی تفسیر کا ازسرِنو آغاز

ان احباب کے تقاضے کی تعمیل میں٬ میں ان درسوں کو ازسرِنو ریکارڈ کر رہا ہوں۔ظاہر ہے کہ یہ دروس تو صرف ٹیپس پر ریکارڈ ہوئے تھے٬ یہ کہیں پورے طور پر لکھے نہیں گئے تھے کہ انہی کو پڑھ کر میں ریکارڈ کرتا چلا جاؤں۔یوں سمجھیے کہ میں ازسرِنو سورۃ فاتحہ کی تفسیر ان درسوں کے ذریعے سے بیان کروں گا۔اصولی طور پر تو یہ وہی ہو گی جو کچھ میں نے پہلے پیش کیا تھا٬ لیکن ظاہر ہے کہ تفسیر کے اعتبار سے اس میں کہیں کچھ کمی اور کہیں کچھ بیشی آ جائے گی۔میں سمجھتا ہوں کہ کمی کچھ کم ہو گی اور بیشی شاید کچھ زیادہ لیکن 1968ء کے بعد اس گیارہ سال کے عرصے میں بہر حال قرآن کے متعلق میرا فہم٬ میری بصیرت٬ کچھ پہلے سے زیادہ ہی ہو گئی ہے٬ فکر میں بھی کچھ زیادہ عمق آ گیا ہے۔اس لیے بعض مقامات پر اس میں ایسے نئے نکات بھی آئیں گے جو پہلے درسوں میں نہیں آ سکے تھے۔میں اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ وہ اس سلسلہ نو کو جو میں اسی سورۃ کی تفسیر کے سلسلے میں٬ ان درسوں کے ذریعے آغاز کر رہا ہوں٬ ان تمام احباب تک پہنچانے کے لیے مجھے توفیق عطا فرمائے۔ وَمَا تَوْفِيقِيٓ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ

قرآن حکیم کی بعض بنیادی اصطلاحات کی اہمیت

اس زمانے میں بھی میں نے سورۃ فاتحہ کے درس کا آغاز کرنے سے پہلے ہی ایک تعارفی درس بھی پیش کیا تھا اور اس میں٬ میں نے بتایا تھا کہ قرآنِ کریم کیا ہے٬ اس کو کیسے سمجھا جاتا ہے٬ اسے کیسے سمجھایا جاتا ہے٬ اس کی بعض بنیادی اصطلاحات کا مفہوم کیا ہے؟ وہ ابتدائی تعارفی درس بھی بڑا ہی مقبول ہوا۔اس لیے میں نے مناسب سمجھا ہے کہ انہی خطوط پر یہ تعارفی درس بھی دوبارہ ریکارڈ کر دیا جائے۔اب وہ تعارفی درس پیش خدمت ہے۔

لفظ قرآن کا بنیادی مفہوم

سب سے پہلے صرف لفظ قرآن کو لیجیے۔اس لفظ کا مادہ ''ق ر ء'' ہے۔عربی زبان میں مادہ کسے کہتے ہیں٬ اور اس کی خصوصیت کیا ہوتی ہے٬ اس کے متعلق میں ذرا آگے چل کر عرض کروں گا۔اس مادہ کے بنیادی معنی ہوتے ہیں ''جمع کرنا اور محفوظ رکھنا''۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جمع اور حفظ بھی تو عربی زبان کے ہی الفاظ ہیں اور خود قرآنِ مجید نے بھی انہیں اپنے ہاں استعمال کیا ہے تو پھر اس لفظ کے مادہ ''ق ر ء'' میں کیا خصوصیت ہے کہ قرآن کا لفظ اس مادہ سے لیا گیا٬ جمع یا حفظ سے نہیں لیا گیا۔قرآنِ مجید کا ایک اعجاز لفظوں کے انتخاب میں ہے اور اس کا یہ انتخاب خود پکار کر کہہ دیتا ہے کہ

ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

''ق ر ء'' کے معنی ہوتے ہیں ''کسی چیز کو اس طرح جمع اور محفوظ رکھنا جس طرح رحم مادر میں نطفہ محفوظ رکھا جاتا ہے''۔

ظاہر ہے کہ رحم میں نطفہ اس طرح محفوظ نہیں رکھا جاتا جس طرح مثلاً کسی تھیلی میں چند سکے محفوظ رکھے ہوں۔ وہ سکے جامد ہوں گے اور ویسے کے ویسے پڑے رہیں گے لیکن رحم میں نطفہ جامد نہیں ہوتا' اس میں بڑھنے' پھولنے' پھلنے' نشوونما پانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم تمام نوعِ انسان کے لیے قیامت تک ضابطہ حیات ہے۔ اس لیے اس میں یہ صلاحیت ہونی چاہیے اور یہ صلاحیت ہے کہ یہ انسانی زندگی کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دیتا چلا جائے' یہ ہر زمانے میں انسانی فکر کی امامت کا فریضہ سرانجام دے' یہ کاروانِ انسانیت کے لیے' ہر منزل میں چراغِ راہ ہو' یہ کسی مقام پر بھی یہ نہ کہہ دے کہ مجھ میں اب آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں رہی۔ ظاہر ہے کہ یہ مقام اسی ذات کو حاصل ہوسکتا ہے' جس میں علم انسانی کی نسبت سے بڑھنے اور پھولنے پھلنے کی صلاحیت ہو۔ یاد رکھیے کہ قرآنِ کریم کے احکام تو اپنے اپنے مقام پر محکم پہاڑ کی طرح اٹل ہیں' ان کے معانی اور مفہوم بھی خود قرآن نے متعین کر دیئے ہیں۔

یہ جو کچھ میں نے کہا ہے کہ اس میں علم انسانی کی نسبت سے بڑھنے' پھولنے پھلنے' آگے جانے کی صلاحیت ہو تو یہ اُن حقائق کے متعلق ہے جو قرآنِ کریم میں بیان ہوئے ہیں۔ یہ وہ حقیقت ہے کہ جسے خود قرآن نے ان حسین وبلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے: سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (41:53)۔ اب یہ جو میں نے اس آیت کے آخر میں (41:53) کہا ہے اور یہی کچھ میں اس کے بعد بھی کہتا چلا جاؤں گا تو آپ سمجھ لیجیے کہ اس کے معنی کیا ہیں۔ یہ (41:53) اس آیت کا حوالہ ہے جو میں نے ابھی تلاوت کی ہے یا اسی طرح جو آگے تلاوت کروں گا' یہ ان کے حوالے ہوں گے۔ میں اس طرح حوالے دیا کرتا ہوں کہ پہلے سورۃ کا نمبر ہوتا ہے اور اس کے بعد آیت کا نمبر ہے مثلاً: (41:53) کے معنی یہ ہیں کہ یہ قرآنِ کریم کی اکتالیسویں سورۃ کی ترپن آیت ہے تو یہ آیت جو میں نے ابھی پیش کی ہے' اس میں قرآن نے کہا تھا کہ سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (41:53)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نوعِ انسان کو اپنی نشانیاں عالمِ انفس وآفاق میں دکھاتے چلے جائیں گے تا آنکہ یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے کہ قرآن نے جو کچھ کہا ہے' وہ حق وصداقت پر مبنی ہے۔ یعنی جوں جوں انفس وآفاق میں پوشیدہ حقیقتیں بے نقاب ہوتی جائیں گی' قرآن کی صداقت مزید نکھرا اور اُبھر کر سامنے آتی جائے گی' انسانی علم کی ہر تحقیق اور سائنس کا ہر یقینی انکشاف قرآنی دعاوی کی شہادت بنتا چلا جائے گا۔ دوسرے مقام پر اس نے کہا ہے کہ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ﴿۸۷﴾ (38:87) یہ عالمگیر انسانیت کے لیے ضابطہ ہدایت ہے' اس لیے وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ﴿۸۸﴾ (38:88) اس میں بیان کردہ حقائق' سب کے سب' ایک ہی وقت میں سامنے نہیں آجائیں گے۔ یہ کچھ وقت کے بعد' بے نقاب ہوں گے اور ہوتے چلے جائیں گے۔

یہ ہے لفظ قرآن کی' مادہ کے اعتبار سے خصوصیت۔ بعض ماہرین لغت کا خیال ہے کہ یہ لفظ قرآن عبرانی ہے اور اس کے معنی ہیں اعلان عام' جسے انگریزی میں Proclamation (اعلامیہ) کہا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے قرآن کے معنی ہوں گے ''مملکت خداوندی کا اعلامیہ''۔ وہ جو عام طور پہ کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے یہ آیت نازل ہوئی تھی: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ

خَلَقَ ۝۱ (96:1) تو اس کے معنی ہوں گے: اٹھ اور دنیا میں اس خدا کی عالمگیر ربوبیت کا اعلانِ عام کر دے جس نے کائنات اور انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ یہ اس حقیقت کا اعلان ہے کہ انسانوں کی ربوبیت یعنی نشوونما' انسانوں کے ہاتھ میں نہیں رہے گی' یہ اس خدا کے نظام کی تحویل میں رہے گی' جس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے اور ان کی نشوونما کا ذمہ لیا ہے۔ سوچیے' عزیزانِ من! کیسا انقلاب آفریں ہے خدا کا یہ اعلان' جو اس روایت کی رو سے ہے کہ سب سے پہلی آیت یہ ہے جسے سب سے پہلے عالم انسانیت میں عام کیا گیا۔

خدا تعالیٰ نے قرآنِ حکیم کو ضابطہ حیات کے معنی میں کتاب بھی کہا ہے

اب آگے چلیے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کو کتاب بھی کہا ہے۔ اس لفظ کا مادہ ''ک ت ب'' ہے' جس کے معنی ''حکم دینے یا کسی بات کو واجب قرار دینے کے ہیں''۔ مثلاً قرآنِ مجید میں کُتِبَ عَلَيۡكُمُ الصِّيَامُ (2:183) تم پر روزے فرض قرار دیئے گئے ہیں۔ كُتِبَ عَلَيۡكُمُ الۡقِتَالُ (2:216) تم پر عندالضرورت جنگ کرنا قانوناً لازم قرار دیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے کتاب کے معنی ''ضابطہ قانون'' کے ہوں گے۔ قرآنِ کریم نے اس لفظ کو ان معانی میں خود استعمال کیا ہے۔ مثلاً سورۃ النساء میں پہلے تفصیلاً بتایا گیا ہے کہ قانونِ خداوندی کی رو سے کون کون سے رشتے تم پر حرام ہیں اور اس کے بعد کہا ہے کہ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ (4:24) یہ تمہارے لیے خدا کا قانون ہے۔ اسی جہت سے قرآن کے متعلق کہا کہ فِيۡهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝۳ (98:3) اس میں نہایت محکم قوانین ہیں۔ لہٰذا قرآنِ کریم کو جب کتاب کہا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ''اس میں قوانین خداوندی دیئے گئے ہیں''۔

اس مقام پر' عزیزانِ من! ضمناً ایک نکتہ کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ دنیا میں قوانین یا Laws دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک وہ جنہیں قوانین فطرت یا Laws of Nature کہا جاتا ہے اور دوسرے وہ جن کا تعلق خود انسان کی اپنی ذات اور اس کی تمدنی زندگی سے ہوتا ہے۔ قوانین فطرت کے متعلق ہر صاحبِ علم یعنی Scientist (سائنسدان) اس کا اعتراف کرتا ہے کہ وہ انسانوں کے بنائے ہوئے نہیں ہیں۔ ایک بہت بڑے سائنسدان کے الفاظ میں یہ یوں ہے کہ ''ہم کتابِ فطرت کو پڑھتے ہیں' اسے لکھتے نہیں ہیں''۔ [1] یعنی فطرت کے قوانین انسانوں کے بنائے ہوئے نہیں ہیں۔ وہ موجود ہیں۔ ہم صرف ان کو سمجھتے ہیں' ان کا انکشاف (Discover) کرتے ہیں۔ جہاں تک دوسری قسم کے قوانین کا تعلق ہے' تو ان کے متعلق یہ سمجھیے کہ یہ وہ قوانین ہیں جن کا تعلق خود انسان کی اپنی ذات اور اس کی تمدنی زندگی سے ہے۔

انسانوں کے بنائے ہوئے معاشرتی قوانین فوز و فلاح کے حامل نہیں ہو سکتے

مغرب کے سیکولر نظام (Secular System) کی عمارت اس مفروضے پر استوار ہوتی ہے کہ انسانوں کو حق حاصل

---

[1] اس سائنسدان کا نام Sulivan (سلیوان) ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: We only read the Book of Nature, we Can`t write it (ہم صحیفہ فطرت کو پڑھ سکتے ہیں' لکھ نہیں سکتے)۔ اس کی تشریح کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 29 (مکمل)' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور 2006ء ص ص۔ 510 تا 312۔

ہے کہ وہ ان قوانین کو خود وضع کریں یعنی انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین انسانوں پر نافذ کیے جائیں' لیکن قرآن کا دعویٰ ہے کہ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کے تحت انسانی معاشرے کو فوز وفلاح نصیب نہیں ہو سکتی۔ ان قوانین کے بنیادی اصول اور مستقل اقدار بھی قوانین فطرت کی طرح خدا ہی کی طرف سے ملنے چاہئیں۔ یہ اصول واقدار وحی کی روح سے ملتے ہیں اور اب قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ قرآن نے جہاں انسانی زندگی سے متعلق قوانین کو کتاب اللہ سے تعبیر کیا ہے' وہاں اس نے قوانینِ فطرت کے لیے بھی یہی اصطلاح استعمال کی ہے۔ مثلاً سورۃ توبہ میں ہے کہ اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (9:36) یہ حقیقت ہے کہ کتاب اللہ کی رو سے مہینوں کی تعداد بارہ ہے اور یہ اس زمانے سے مقرر ہے جب خدا نے ارض وسمٰوات کو پیدا کیا تھا۔ یعنی جتنی مدت میں زمین سورج کے گرد پورا چکر کاٹتی ہے وہ ایک سال کا عرصہ ہوتا ہے اور اس عرصہ کو بارہ پر تقسیم کر کے مہینوں کا شمار کیا جاتا ہے۔ اس تقسیم کی رو سے' ہر سال کا ہر مہینہ' سابقہ سال کے اس مہینے کے مطابق ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم میں اس کی وضاحت کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی؟ اس کے متعلق میں متعلقہ مقام پر وضاحت کروں گا۔ اس وقت صرف یہ سمجھیے کہ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ بات قانونِ فطرت کی ہو رہی تھی یعنی اللہ تعالیٰ نے قانونِ فطرت کو بھی کتاب اللہ سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے بعد کہا ہے کہ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ (9:36) ان بارہ میں سے چار مہینے ایسے ہیں جن میں جنگ ممنوع قرار دی گئی ہے۔ یہ قانون انسانی معاشرہ سے متعلق ہے' فطرت سے نہیں ہے اور اس کے بعد ہے کہ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (9:36) یہ خدا کا دینِ قیم ہے یعنی قوانین فطرت اور انسانی زندگی سے متعلق قوانین دونوں کے مجموعے کا نام الدین ہے۔ اور یہی دینِ قیم ہے' یہی دین محکم ہے' خدا کی طرف سے دیا ہوا ہے۔

برادرانِ عزیز! ان تصریحات سے واضح ہے کہ کتاب اللہ کے دو حصے ہیں: ایک صحیفہ فطرت ہے' جو خارجی کائنات میں بکھرا پڑا ہے اور دوسرا صحیفہ وحی ہے' جس کا محفوظ اور مکمل مجموعہ قرآنِ کریم ہے۔

قوانینِ فطرت سے اعراض کا نتیجہ جہنم ہے

قرآنِ کریم کی رو سے یہ دونوں قوانین خدا کی طرف سے عطا کردہ ہیں اور دونوں کی پابندی ضروری ہے۔ قوانینِ فطرت کی پابندی سے فطرت کی قوتیں مسخر (Harness) ہو جاتی ہیں اور قوانینِ وحی کی پابندی سے یہ قوتیں انسانی ذات کی نشوو ارتقاء اور عالمگیر انسانیت کی فلاح وبہبود کے لیے صرف کی جاتی ہیں۔ اگر ان میں سے کسی ایک ضابطہ قوانین سے بھی اعراض برتا جائے' تو زندگی کا اعتدال قائم نہیں رہتا اور کاروانِ انسانیت منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ اگر قوانین فطرت سے اعراض برتا جائے تو دین مذہب میں تبدیل ہو کر خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (2:85) دنیاوی زندگی میں ذلت وخواری کا موجب بن جاتا ہے اور اگر مستقل اقدارِ خداوندی سے اعراض برتا جائے' تو دنیا اس جہنم میں گرفتار ہو جاتی ہے جس کے شعلے آج تمام اقوامِ عالم کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہیں۔ اس روشِ زندگی کو قرآنِ کریم نے کتاب کے ایک حصے پر ایمان اور دوسرے حصے سے کفر سے تعبیر کیا ہے۔ سورۃ بقرہ میں ہے کہ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (2:85)

کیا یہ لوگ کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے اور دوسرے حصے سے کفر برتتے ہیں؛ بلکہ اس میں تو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ کیا تم لوگ ایسے ہو کہ تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے سے کفر برتتے ہو؛ تو یاد رکھو! کہ فَمَا جَزَآءُ مَنۡ یَّفۡعَلُ ذٰلِکَ مِنۡکُمۡ اِلَّا خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۚ وَیَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ یُرَدُّوۡنَ اِلٰۤی اَشَدِّ الۡعَذَابِ (2:85) جو ایسا کرے گا اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ دنیا کی زندگی میں ذلت و خواری اس کے حصے میں آئے گی اور قیامت میں وہ شدید ترین عذاب میں مبتلا ہوگا۔

انسانی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کرنا کفر ہے:

تاریخِ انسانیت اس حقیت پر شاہد ہے کہ تسخیرِ فطرت اور مستقل اقدار کو جب بھی الگ الگ رکھا گیا؛ اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہ نکلا۔ انسانی زندگی ایک ناقابلِ تقسیم وحدت (Indivisible Unit) ہے۔ اسے مختلف حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ کتاب میں تفریق کا ایک پہلو تو یہ ہے؛ جس کی طرف میں نے ابھی ابھی اشارہ کیا ہے یعنی قوانینِ فطرت اور مستقل اقدار میں مُغَایَرَتْ [1] پیدا کرنا۔ دوسرا گوشہ یہ ہے کہ خود قرآنِ کریم کے ایک حصے پر عمل کرنا اور دوسرے سے اعراض برتنا۔ اس کا نتیجہ بھی ذلت و خواری کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ہم نے صدیوں سے یہی روش اختیار کر رکھی ہے اور اس کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ مثال کے طور پر دیکھیے کہ کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ (2:183) اور کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الۡقِتَالُ (2:216) دونوں یکساں احکامِ خداوندی ہیں؛ لیکن ہم کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ (2:183) پر تو اس شدت سے عمل پیرا ہوتے ہیں لیکن کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الۡقِتَالُ (2:216) کو اپنی زندگی سے یکسر خارج کر رکھا ہے حالانکہ مومن کی ساری زندگی مجاہدانہ عسکریت کی زندگی تھی۔ روزوں پر زور اور عسکری تربیت سے اجتناب؛ یہ کتاب کے ایک حصے پر ایمان اور دوسرے حصے سے کفر کے مترادف نہیں تو اور کیا ہے۔

الحاد

اتنا ہی نہیں کہ کتاب کے ایک حصہ پر عمل اور دوسرے سے مجرمانہ تغافل! قرآن کریم تو یہاں تک بھی کہتا ہے کہ کسی ایک قانون یا صفتِ خداوندی کی پابندی میں اس قدر شدت اختیار کر لینا کہ اس سے دوسرے قوانین یا صفاتِ الٰہیہ نظر انداز ہو جائیں؛ تو اس کا نتیجہ بھی خوشگوار نہیں نکل سکتا۔ ایک جگہ اس نے کہا ہے کہ اِنَّ الَّذِیۡنَ یُلۡحِدُوۡنَ فِیۡۤ اٰیٰتِنَا لَا یَخۡفَوۡنَ عَلَیۡنَا (41:40) جو لوگ ہمارے قوانین میں ایک طرف نکل گئے ان کی یہ روش ہماری نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ دوسرے مقام پر ہے کہ وَذَرُوا الَّذِیۡنَ یُلۡحِدُوۡنَ فِیۡۤ اَسۡمَآئِہٖ (7:180) جو لوگ صفاتِ خداوندی میں سے کسی ایک صفت کو لے کر اس میں ایک طرف دُور تک نکل جائیں؛ تم ان سے کنارہ کشی کرو۔ مثال کے طور پر یہودی اور ہندو خدا کی صفتِ عدل میں اس قدر متشدد ہو گئے کہ انہوں نے لغزش خوردہ انسانوں کے لیے باز آفرینی کا کوئی دروازہ ہی کھلا نہ رہنے دیا۔ دوسری طرف

[1] غیریّت؛ بے گانگی

عیسائیت' اس کی صفتِ رحیمیت میں اس قدر متشدد ہوگئی کہ اس نے زندگی سے عمل کو یکسر خارج کر دیا اور ہر بات کو خدا کا رحم اور Grace پر منحصر قرار دے دیا۔ قرآنِ کریم کی رو سے وہ روش بھی غلط تھی اور یہ بھی غلط۔ صحیح روش وہی ہے جو ان قوانین وصفات کی پابندی میں' صحیح تناسب وتوازن لیے ہوئے' انہیں علی حدِ بشریت' اپنے اندر منعکس کرے اور عملی زندگی میں انہیں معیار قرار دے۔ اس وقت میں صرف انہی اشارات پر اکتفا کرتا ہوں تفصیل اس اجمال کی اپنی اپنی جگہ آپ کے سامنے بعد میں آتی رہے گی۔

قرآن حکیم کے علاوہ دنیا میں کوئی کتاب بھی بغیر سوچے سمجھے نہیں پڑھی جاتی

قرآنِ کریم کو کتاب کہنے سے اس حقیقت کی طرف توجہ مبذول کرانا بھی مقصود تھا کہ یہ ایک کتاب ہے اور جس طرح تم کسی کتاب کو پڑھتے ہو اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہو' اسی طرح اسے بھی پڑھو اور اس سے مستفید ہو۔ آپ سوچیے کہ اگر آپ کو کوئی ایسی کتاب دے دی جائے' جس کی زبان سے آپ ناواقف ہوں' تو آپ اس کتاب کو کبھی نہیں پڑھتے حتیٰ کہ اگر اُس کی زبان مشکل ہو' تو آپ اس کے دو چار صفحے پڑھ کر الگ رکھ دیتے ہیں کہ اس کا معیار میری علمی سطح سے اونچا ہے۔ اگر اس کتاب کا پڑھنا آپ کے لیے ضروری ہے تو آپ اس کی زبان سیکھتے ہیں اور اپنے اندر اتنی استعداد پیدا کرتے ہیں' جس سے وہ کتاب سمجھ میں آجائے۔ آپ کبھی یہ نہیں کرتے کہ آپ وہ کتاب پڑھتے جائیں خواہ وہ آپ کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ دنیا کی کسی کتاب کے ساتھ آپ یہ نہیں کرتے لیکن اس میں ایک استثناء' (Exception) ہے اور وہ ہے قرآنِ کریم۔ اس کے متعلق یہ عقیدہ وضع کر لیا گیا کہ اس کی زبان آتی ہو یا نہ آتی ہو' اسے پڑھتے رہنا چاہیے' اس سے ثواب حاصل ہوتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا ہے کہ دنیا کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہے' جسے اس شدت اور کثرت سے پڑھا جاتا ہو' اور اس کے ساتھ ہی دنیا کی کوئی اور کتاب ایسی نہیں جسے بے سمجھے پڑھا جاتا ہو۔

قرآنِ حکیم کے خلاف ایک گہری سازش

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو قرآنِ کریم سے دور رکھنے کے لیے یا یوں کہیے کہ قرآن کو ان کی نگاہوں سے اوجھل کرنے کے لیے یہ ایک بڑی گہری [1] سازش تھی' جسے تقدس (Sacred) کا لباس پہنا کر مزین بنا دیا گیا۔ یوں قرآن کتاب نہ رہا۔ معاف رکھیے' جنتر منتر (Mumbo Jumbo) کا مجموعہ بن کر رہ گیا۔ کتاب اور جنتر منتر میں فرق یہ ہوتا ہے کہ کتاب کے الفاظ سمجھ کر پڑھے جاتے ہیں اور جنتر منتر کے الفاظ بلا سمجھے دہرائے جاتے ہیں' یہاں تک کہ قرآن کے الفاظ کے تعویذ لکھے جانے لگے' اس کی آیات کے ورد ہونے لگے اور اس کا نام رکھا گیا ''اعمالِ قرآنی'' اور ایسا کرنے والا کہلانے لگا ''عامل''۔ سوچیے کہ ہم اس کتاب کے ساتھ کیا کر رہے ہیں؟ یاد رکھیے! جب تک مسلمان قرآن کو کتاب نہیں سمجھتا' وہ اس سے کچھ فائدہ

---

[1] قرآنِ کریم کے خلاف مزید سازشوں (Conspiracies) کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء' ص ص 221 تا 242۔

حاصل نہیں کر سکتا۔

قرآنِ حکیم نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں ہی مدون شکل میں موجود تھا

برادرانِ عزیز! یہاں ایک اور نکتہ کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ بقرہ کے شروع میں کہہ دیا تھا کہ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ (2:2) یہ ایک ''کتاب'' ہے۔ عربوں کے ہاں کتاب کا لفظ اس وقت بولتے تھے جب ''منتشر اجزاء کی شیرازہ بندی کر کے' ان میں لوہے کا کڑا (Iron Ring) پرو دیا جاتا تھا یا سلائی کر دی جاتی تھی''۔ قرآن کو الکتاب کہنے سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ یہ صحیفۂ مقدسہ حضورِ نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں ایک مرتبہ اور مدوّن کتاب کی شکل میں موجود تھا' جس کی شیرازہ بندی بھی ہو چکی تھی۔ سورۃ الطور میں ہے کہ وَالطُّوْرِ ۝۱ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۝۲ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ۝۳ (52:1-3) قرآن سطروں میں لکھی ہوئی کتاب تھی۔ پہلے اسے منتشر اوراق پر لکھا جاتا تھا اور بعد میں اس کی شیرازہ بندی کی جاتی تھی۔

عربوں کے ہاں ہرن کی کھال چھیل کر اسے (چرمی کاغذ) Parchment [1] کی شکل میں' قرطاس بنا لیتے۔ اسے رَقّ کہا جاتا تھا۔ جن تحریروں کو محفوظ رکھنا مقصود ہوتا' انہیں اس پر قلم بند کر لیتے تھے۔ جہاں تک کاتبین وحی کا تعلق ہے' سورۃ عبس میں ہے کہ قرآن کی کتابت بڑے باعزت اور قابلِ اعتماد کاتبوں نے کی تھی (80:15-16)۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ روایات جن میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں قرآن جمع اور مدوّن نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی تدوین بعد میں منتشر ٹھیکریوں' ہڈیوں اور پتوں کی مدد سے حضرت ابوبکر صدیق (632-634) یا حضرت عمر فاروق (634-645) یا حضرت عثمان غنی (645-656ء) رضی اللہ عنہم کے زمانے میں ہوئی تھی' وضعی ہیں' جنہیں قرآن کی اہمیت اور خصوصیت کو نظروں سے گرانے کے لیے اختراع کیا گیا ہے۔ قرآن حضورؐ کے زمانے میں' حضور ﷺ کی زندگی میں ہی' اسی شکل میں مرتب' مدوّن' قرطاس پر موجود تھا' جس شکل میں آج ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے۔ اس میں ایک لفظ بھر کی کمی بیشی کہیں نہیں ہوئی۔ اسی مرتب اور مدوّن کتاب کے متعلق کہہ دیا گیا کہ یہ کتاب مکمل ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا: وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (6:115)۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ خدا نے اسے نازل کیا ہے اور وہ خود اس کی حفاظت کا ذمے دار ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (15:9)۔ خدا نے اس کی تصریح فرما دی کہ قرآنِ کریم ایک مرتب کتاب کی شکل میں رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں موجود تھا۔ یہ ہر طرح سے مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی اور یہ بھی

---

[1] Parchment: بھیڑوں' بکریوں' میمنوں یا بچھڑوں کی کھال جسے اس طرح تیار کیا جائے کہ اس پر لکھا جا سکے۔ (حوالہ ڈاکٹر جمیل جالبی (مدیر): قومی انگریزی اردو لغت' مقتدرہ قومی زبان' اسلام آباد' 1992' ص 1412) نیز......

The skin of a sheep, or goat, prepared for writing or painting upon A written text. stiff, durable paper made in imitation of the material. Pergamum in Western Turkey (where it was first used as a substitute for Papyrus) (Ref. Reader`s Digest (1990) Universal aictionary. London: The Readers Digest Association Limited. pp.1124-1125)

کہ یہ قیامت تک کے لیے محفوظ رہے گا۔

ختمِ نبوت

برادرانِ عزیز! اس سے آپ، علاوہ دیگر امور، اس حقیقت کو بھی دیکھ لیں گے کہ قرآنِ کریم نے ختمِ نبوت کی حقیقت کو کس طرح واضح کر دیا ہے۔ جب ایک ایسا ضابطہ حیات ہو جو تمام نوعِ انسان کے لیے، قیامت تک کے لیے، مرتب اور محفوظ شکل میں دے دیا گیا ہو اور اس کے بعد اس میں کوئی تبدیلی بھی نہ کر سکتا ہو' تو ایسی کتاب کی موجودگی میں کسی نبی یا رسول کے آنے کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ قرآن کی ابدّیت، اکملیّت، محفوظیّت اور عالمگیریّت خود ختمِ نبوت کی دلیل ہے۔ قرآن کی نص صریح کی روح سے کوئی نبی یا رسول بغیر کتاب کے نہیں آیا لہٰذا جب خدا کی طرف سے آخری کتاب دی جائے تو اس کا لانے والا خود بخود آخری رسول ہو جائے گا۔ اس لیے نبی اکرم ﷺ خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں اور اس کی کتاب آخری کتاب ہے جو قیامت تک کے لیے محفوظ ہے۔

قرآنِ حکیم کے لیے عربی زبان کی خصوصیات کی وضاحت

اب آیئے قرآن کریم کی زبان کے متعلق۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں کہا ہے کہ یہ کتاب بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيۡنٍ﴿۱۹۵﴾ (26:195) ہے۔ یعنی اس کتاب کی زبان عربی مبین ہے اور دیگر مقامات پر بھی اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ یہ کتاب عربی مبین میں نازل ہوئی ہے۔ خود لفظ عربی کے معنی بھی ''فصیح اور واضح کے ہیں'' اور جب اس کے ساتھ ''مبین'' کا اضافہ کر دیا جائے تو اس کے واضح تر ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا۔ یہ کتاب واضح ہے اور غَيۡرَ ذِىۡ عِوَجٍ (39:28) ہے، یعنی اس میں کوئی پیچ و خم نہیں، ابہام نہیں، التباس نہیں: صاف، نکھری، سیدھی، واضح، کتابِ روشن، حتیٰ کہ قرآن کو نور بھی کہا گیا ہے، یعنی خود روشن اور دنیا کو روشن کرنے والی کتاب۔ جس طرح روشنی اپنے وجود کو یا اپنے آپ کو دکھانے کے لیے کسی اور روشنی کی محتاج نہیں ہوتی، اسی طرح قرآنِ کریم بھی اپنے مطالب ومفاہیم واقدار واصول و پیغام وتعلیم کو واضح کرنے کے لیے کسی خارجی روشنی کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی وضاحت ذرا آگے چل کر آئے گی۔

قرآنِ حکیم صرف اپنے الفاظ میں ہی قرآنِ حکیم ہے

جہاں تک عربی زبان کا تعلق ہے، قرآنِ کریم کی زبان اس کے علاوہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی تھی، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اصول یہ بتایا ہے کہ جس قوم کی طرف کوئی رسول بھیجا جاتا ہے، اُس رسول کا پیغام اُسی قوم کی زبان میں ہوتا ہے۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ کے اوّلیں مخاطب عرب تھے اس لیے قرآنِ کریم انہی کی زبان میں آیا اور انہی کی زبان میں آنا چاہیے تھا لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مشیت کے پروگرام میں کچھ ایسا تھا کہ وہ زبان جس میں قرآن نازل ہونا تھا، ایسی جامع، عمیق اور وسیع ہو کہ وہ قرآنی حقائق کی متحمل ہو سکے۔ علم الالسنہ کے ماہر بتاتے ہیں کہ اس باب میں دنیا کی کوئی زبان عربی زبان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے تو خدا نے انہیں بیٹے کے حلق پر چھری چلانے سے روک دیا اور کہا کہ ہم اسے ایک عظیم قربانی کے لیے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑے بیٹے تھے اور باپ کی مملکتِ عظیم کا انہی کو وارث ہونا تھا لیکن حکم یہ دیا گیا کہ انہیں حجاز کی وادیٔ غیر ذی زرع میں بسایا جائے۔ غیر ذی زرع کہ جہاں کچھ اگتا ہی نہیں، جہاں کچھ ہوتا ہی نہیں۔ کہا کہ انہیں اس وادی میں بسایا جائے تا کہ یہ وہاں خانۂ خدا کی تولیت کا فریضہ سرانجام دیں اور مملکتِ شام کی سرداری حضرت اسحاق علیہ السلام کو دے دی جائے۔ اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد بنی اسرائیل، امورِ جہاں بانی میں مصروف رہی۔ اس کے حصے میں شوکتِ سلیمانی اور سطوتِ داؤدی آئی، لیکن بنی اسماعیل اسی وادیٔ غیر ذی زرع میں نہایت سادہ زندگی بسر کرتے رہے۔ انہوں نے نہ کوئی حکومت قائم کی اور نہ ہی کسی تہذیب وتمدن کی بنا ڈالی، یہ ایک ہی کام کرتے رہے یعنی عربی زبان کی تشکیل، تعمیر اور تہذیب۔ انہوں نے اس زبان کو اس مقام پر پہنچا دیا کہ دنیا کی کوئی زبان اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتی۔

یہ ہمارا عقیدت مندانہ دعویٰ ہی نہیں بلکہ دنیا کے محققین پوری تحقیق وتفتیش کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ ڈاکٹر بک (1) (Dr. Bucke) نے اپنی مشہور کتاب Cosmic Consciousness میں مشہور مستشرق Max Muller کی تحقیقات کے حوالے سے لکھا ہے کہ ’’جس زمانے میں تمام انڈو یورپین زبانوں (Indo-European languages) میں مادی تصورات (Root Concepts) کی تعداد ایک سو اکیس (121) تک پہنچ پائی تھی، عربوں کے ہاں صرف اونٹ کے تضمنات میں پانچ ہزار سات سو چوالیس (5744) الفاظ موجود تھے۔ سوچیے، اس سے اس زبان کی وسعتوں کا اندازہ لگ سکتا ہے۔

عربی زبان کے مادوں کی تعداد 25 ہزار کے قریب ہے

عزیزانِ من! یہ عربی زبان بڑی سائنٹفک زبان ہے۔ اس میں ایک مادہ یعنی Root ہوتا ہے جو عام طور پر تین حرفوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس مادے کے معانی میں ایک بنیادی خصوصیت ہوتی ہے، جو ان تمام الفاظ میں جھلکتی چلی جاتی ہے، جو اس مادے سے مختلف ابواب میں بنائے جاتے ہیں۔ ان مادوں کی تعداد پچیس ہزار (25000) کے قریب ہے۔ آپ اندازہ لگا لیجیے کہ ان مادوں سے جو الفاظ بنائے گئے ہوں گے، ان کی تعداد کس قدر ہو گی، اور پھر اس میں دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مختلف ابواب ہیں، اوزان ہیں، ہر باب کی ایک الگ خصوصیت ہوتی ہے۔ یعنی ایک مادہ یا Root ہے، جس کی ایک متعین خصوصیت ہے۔ وہ خصوصیت ہر اس لفظ میں پائی جائے گی جو اس Root (مادہ) سے بنے اور پھر وہ الفاظ ان ابواب کے مطابق بنیں گے اور ہر باب کی ایک الگ خصوصیت ہو گی۔ اس لیے جو لفظ بھی آپ کے سامنے آئے، اس کے باب کو دیکھیے۔ اور اس کے Root (مادہ) کو دیکھیے۔ ان دونوں کو ملانے سے اس کا ایک متعین مفہوم آپ کے سامنے آ جائے گا۔ یہاں تک

(1) Richard maurice Bucke.

کہ یہ ترتیب اس مادے میں فلاں اور فلاں حرف اکٹھا آئے تو اس کی یہ خصوصیت ہوگی' یعنی جتنے بھی Roots (مادے) ایسے ہوں گے جن میں وہ دو حرف آ جائیں ان میں وہی خصوصیت ہوگی' جو ان دو حرفوں کے اکٹھے ہونے سے بتائی گئی ہے۔ اندازہ لگایئے کہ دنیا کی کوئی زبان بھی ایسی ہے جو اس کا مقابلہ کر سکتی ہو۔ یہ تھی وہ زبان جس میں قرآن نازل ہوا۔ [1]

قرآنِ حکیم کی عربی زبان آسان ترین بھی ہے اور نہایت عمیق و وسیع بھی

پہلے تو یہی بات یہاں سے سمجھ میں آتی ہے کہ یہ زبان بڑی سائنٹیفک (Scientific) واقع ہوئی ہے۔ اس لیے اس کا سمجھنا بڑا آسان ہے۔ یہ جو اس زبان کو ہوّا بنا کر رکھ دیا گیا ہے تو یہ بھی ایک سازش ہے' جس کا مقصد یہ ہے کہ عام مسلمان قرآن کو براہِ راست سمجھنے نہ لگ جائے اور یہ خاص طبقے کی اجارہ داری رہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اگر آپ میں سے کسی نے عربی ادب پر حاوی ہونا ہو' تو وہ واقعی بڑی محنت بھی چاہتا ہے' بڑی وسعت و معلومات چاہتا ہے' تعلیم میں بھی بہت آگے بڑھنا پڑھتا ہے لیکن قرآنِ کریم تو اس قدر آسان عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے یعنی عجیب چیز ہے کہ زبان کے اعتبار سے اتنا جامع' اتنا وسیع' اتنا عمیق اور سمجھنے کے اعتبار سے اس قدر آسان! خود اس کا دعویٰ ہے کہ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ (54:17) یہ حقیقت ہے کہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے بڑا آسان بنایا ہے۔ دوسری جگہ ہے کہ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ (41:3) یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیات کو نکھار کر' الگ الگ کر کے' واضح طور پر' بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ قرآن اُن لوگوں کے لیے جو علم و بصیرت سے کام لیں' ایک واضح ضابطہ حیات بن گیا۔ یہ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (16:89) ہے یعنی جن امور کا ذکر اس میں کیا گیا ہے' انہیں بڑی وضاحت سے کھول کر بیان کیا گیا ہے۔

ان تصریحات سے ایک بات واضح طور پر سامنے آ جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے سمجھنے کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ اس میں جو الفاظ آئے ہیں' پہلے Roots یا مادہ کی روح سے ان کے معانی متعین کیے جائیں اور پھر یہ دیکھا جائے کہ زمانہ نزولِ قرآن میں ان الفاظ کے معانی کیا لیے جاتے تھے۔ ایک لفظ کے Shape (شکل و ساخت) کے اعتبار سے کئی ایک معانی یا مفہوم ہوتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ جس زمانے میں قرآنِ کریم نازل ہوا تھا عرب اس کے کیا معنی لیتے تھے۔

ہزار سال سے مرتب کی جانے والی لغات کی ایک بنیادی کمزوری

برادرانِ عزیز! قرآنِ کریم کا مفہوم اُسی صورت میں سمجھ میں آ سکتا ہے جب پہلے یہ معلوم ہو کہ زمانہ نزولِ قرآن میں عرب ان الفاظ کا جو قرآنِ کریم میں آئے ہیں کیا مطلب یا معنی لیا کرتے تھے۔ قرآنِ کریم کے متعلق ہمارے ہاں اس ہزار سال میں اس قدر لکھا گیا ہے کہ اس سے کمروں کے کمرے بھر جائیں لیکن آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ قرآنِ مجید کا کوئی

---

[1] ان نکات کی مزید تشریح و تبیین کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورۃ انبیاء' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص ص 20-21'؛ بالخصوص انہی صفحات کے فٹ نوٹ (1,2)20 اور (3-4)21۔

لغت ایسا نہیں جو اس انداز سے مرتب کیا گیا ہو۔ یعنی جو چیز قرآن کے سمجھنے میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے، وہ چیز ہمارے ہاں کے اس لٹریچر میں کبھی مرتب ہی نہیں ہوئی۔ لے دے کر ایک امام راغب اصفہانی ❶ (متوفی قریب 502ھ) کی لغت ہے، جسے المفردات فی غریب القرآن کہتے ہیں لیکن وہ بڑا مختصر سا لغت ہے۔ وہ اس نہج پر مرتب نہیں کیا گیا جس کا میں نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے۔ ❷

لغت کے مرتب کرنے میں میری سعی و کاوش

قرآنِ کریم کا صحیح مفہوم سمجھنے کے راستے میں میری سب سے بڑی اور پہلی دشواری بھی یہی اسی قسم کے لغت کا فقدان تھا۔ لہٰذا میرے لیے ایسا لغت مرتب کرنا یوں کہیے کہ میرے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔ تنہا بے ساز و سامان کوئی رفیقِ کار نہیں، کوئی جماعت نہیں اور پھر غالباً آپ احباب کو اس کا علم ہوگا کہ میں مرکزی حکومتِ ہند میں ملازم بھی تھا لیکن چونکہ مجھے قرآنِ کریم کے ساتھ عشق تھا اور عشق اس قسم کی خارا شگافیوں کو آسان بنا دیا کرتا ہے۔ میں نے اللہ کا نام لے کر اس قسم کے لغت مرتب کرنے کا کام شروع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فضل و کرم سمجھیے کہ میں برسہا برس کی محنت شاقہ کے بعد اس میں کامیاب ہوا اور میرا یہ لغت چار جلدوں میں چھپ کر شائع ہو چکا ہے اور بڑا ہی مقبول ہوا ہے کیونکہ یہ اپنے انداز کی منفرد ڈکشنری یا لغت ہے، جس کا کہیں دوسرا جواب نہیں ملتا۔ اس پر میں بدرگاہِ رب العزت جس قدر بھی سجداتِ شکرانہ ادا کروں، کم ہیں۔ اس لغت کی مدد سے قرآنِ کریم کے الفاظ کے صحیح معانی تو متعین ہو گئے۔ بظاہر یہ نظر آئے گا کہ اس کے بعد قرآنِ کریم کی آیات کا ترجمہ کرنا بہت آسان ہو جائے گا یا بہت آسان تھا لیکن یہاں ایک اور دشواری شروع ہوئی۔

الفاظ کے معنی تو یہ کیے لیکن قرآنِ کریم تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک وحی کردہ کتاب ہے اور اس کے تو اعجاز ہی اس قسم کے ہیں کہ انسان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ بالآخر یہ کتاب کس انداز سے مرتب ہوئی ہے۔ اس کا انداز گرانقدر معجزانہ ہے۔ اس میں اس کے خاص اسلوب کو بنیادی دخل ہے۔ اس کی آیتوں کے اندر جو الفاظ آئے ہیں، ان کی ترتیب اور ترکیب تو کچھ اس انداز کی ہے کہ ان کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ بات میں محض اعتقاد کی بنا پر نہیں کہہ رہا بلکہ یہ وہ حقیقت ہے جسے ہم تو ایک طرف، مغرب کے بڑے بڑے مستشرقین، جو عربی زبان کے فاضل ہیں، وہ بھی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس کی زبان کا اسلوبِ بیان اس قسم کا ہے کہ اس کا ترجمہ دنیا کی کسی زبان میں ہو نہیں سکتا۔ H.A.R Gibb عربی زبان کا بہت بڑا فاضل ہے۔ اس کی ایک کتاب Modern Trends In Islam (اسلام میں جدید رجحانات) ہے۔ اس کا 1945 کا ایڈیشن میرے سامنے

❶ Imam Raghib AL-Isphahani of Persia (1327-1409A.D) (He was) beheaded. (Re. Some Quranic Voices by Shabbir Ahmed, M.D. Florida, USA, Through Website sent on Saturday, April 01, 2006, 6:03pm on the Subject. 2: Analysis of Criticism Against Quran upholders (Questions/Answers): Website Islamdawn.

❷ مزید لغت کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ طٰہٰ، ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ، لاہور 2005ء، ص ص 55-154 اور انہی صفحات کا فٹ نوٹ 2۔

ہے۔ وہ اس کتاب میں لکھتا ہے کہ ''حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ کریم کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا...... جس طرح کسی بلند شاعری کا ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ وحی کی زبان ہی مختلف ہوتی ہے...... قرآنِ کریم کا انگریزی زبان میں ترجمہ کرو تو اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ اس کے عربی زبان کے تراشے ہوئے نگینوں کے گوشوں کو جامع طور پر سامنے لانے کے بجائے، مترجم اپنے وضع کردہ ایسے الفاظ استعمال کرے گا جو اصلی الفاظ کی وسعت اور جامعیّت کو مقید کردیں گے۔ ایسی آیات میں، جن میں عام واقعات یا قوانین واحکام مذکور ہوں، ترجمہ کا یہ نقص شاید زیادہ نقصان رساں نہ ہو لیکن، بایں ہمہ، جو مدوجزر، جو نشیب وفراز، جو بلندیاں اور گہرائیاں، جو لطافتیں اور باریکیاں، اور اس کے ساتھ جو جوش وخروش، اصل کتاب میں جلوہ فرما ہے، وہ ترجمہ میں کیا آسکے گا! ذرا اس صاف اور سیدھی سی آیت کو لیجیے: اِنَّا نَحۡنُ نُحۡیٖ وَنُمِیۡتُ وَاِلَیۡنَا الۡمَصِیۡرُ ﴿۴۳﴾ (50:43) اور انگریزی ہی نہیں، دنیا کی کسی زبان میں اس کا ترجمہ کر کے دکھایئے۔ اس کے چھ الفاظ میں، جو پانچ مرتبہ ''ہم (We) کی تکرار ہے، اسے کون سی زبان ادا کر سکے گی؟''

قرآن حکیم کے ترجمہ کی بجائے اس کا مفہوم بیان کرنے کی طرح ڈالی گئی

عزیزانِ من! قرآنِ کریم کے الفاظ کے معانی متعین کرنے کے بعد بھی اس کی آیات کا ترجمہ کرنا میرے لیے کیا، کسی کے بھی بس میں نہ تھا۔ لہٰذا میں نے ترجمے کے بجائے قرآنِ کریم کا مفہوم لکھا۔ اس کا نام ہے ''مفہوم القرآن''۔ میرا یہ ''مفہوم القرآن'' اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے الحمد سے والناس تک مسلسل تیس پاروں کا مفہوم ہے۔ اور وہ نہایت حسن وخوبی سے شائع ہو چکا ہے۔ اسے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ جن لوگوں نے اسے دیکھا ہے، وہ متفقہ طور پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس سے قرآنِ کریم کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں رہتی۔

قرآنِ حکیم کی وضاحتوں کے بارے میں ارشاد خداوندی

یہ کچھ تو قرآنِ کریم کی آیات کے مفہوم کے متعلق تھا جب کہ اس سلسلہ میں قرآنِ کریم کا ایک اور اہم باب بھی ہے جو اس نازل کرنے والے خدا نے کہا ہے کہ اِنَّ عَلَیۡنَا بَیَانَہٗ ﴿ؕ۱۹﴾ (75:19) قرآن کی وضاحت خود ہمارے ذمے ہے۔ اس کے لیے طریق کیا اختیار کیا گیا ہے، یہ بات غور سے سمجھنے کے قابل ہے۔ قرآن کا انداز عام کتابوں جیسا نہیں۔ عام کتابوں کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اس میں وہ کتاب مختلف ابواب میں تقسیم کردی جاتی ہے۔ ہر باب کا ایک خاص موضوع ہوتا ہے اور اس موضوع سے متعلق تعلیم اس باب کے تحت مربوط طور پر دے دی جاتی ہے یعنی جب ایک باب ختم ہوتا ہے تو جو کچھ اس موضوع کے متعلق کہنا مطلوب ومقصود ہے، وہ اس باب کے اندر آ جاتا ہے۔ قرآن اس طرح کی تصنیف کردہ کتاب نہیں۔ یہ یوں سمجھیے کہ جیسے تئیس سال میں عطا فرمودہ مختلف خطبات کا مجموعہ ہو۔ اس میں ایک بات ایک مقام پر آئی ہے۔ اس کی مزید وضاحت دوسرے مقام پر ہے، تفسیر کسی اور جگہ ہے، استثناء کسی اور سورت میں ہے۔ نیز مختلف حقائق کو مختلف واقعات کے ضمن میں بار بار دہرایا گیا ہے۔ اسے تصریفِ آیات سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی آیات کو پھیر پھیر کر لانا۔ سورۂ انعام میں ہے کہ

وَ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ﴿۱۰۵﴾(6:105)۔اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن میں مختلف آیات کو پھیر پھیر کر اس لیے لایا گیا ہے کہ بات اس طرح واضح ہو جائے جیسے چھلکا اور مغز الگ ہو جاتے ہیں اور یوں بات نکھر اور ابھر کر سامنے آجائے۔اس کے بعد یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے سمجھنے کے لیے دو بنیادی چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک محاورۂ عرب یعنی نزولِ قرآن کے زمانے میں عربی زبان کے ان الفاظ کا جو قرآن میں استعمال ہوئے ہیں، وہ مفہوم' جو عرب لیتے تھے' اس سے واقفیت۔دوسری بات قرآنِ کریم پر اتنا عبور ہو کہ جو بات کسی ایک آیت میں کہی گئی ہے یہ چیز بیک وقت آپ کے سامنے آجائے کہ اس کے متعلق قرآن کے دیگر مقامات میں کیا آیا ہے۔

قرانِ حکیم کے انسائیکلو پیڈیا یا تبویب کی اہمیت اور اس کی تیاری کا مرحلہ

جس طرح قرآنِ کریم کے الفاظ کے متعلق بیان کیا گیا ہے' اس قسم کا بھی کوئی لغت پہلے سے موجود نہیں تھا۔قرآنِ کریم کے اس انداز کو آپ انسائیکلو پیڈیا کہیے کہ عربی زبان میں اسے تبویب [1] کہتے ہیں' یعنی باب کرنا قرآنِ کریم کے متعلق اس قسم کی بھی کوئی کتاب اس سے پہلے موجود نہیں تھی' یعنی ایسی کتاب جو ہر اس موضوع کے متعلق بیک وقت بتا دے جو آپ کے ذہن میں آئے کہ قرآنِ کریم میں یہ موضوع کس کس مقام میں آیا ہے' اس کے متعلق کیا کیا آیا ہے' وضاحت کہاں ہے' اضافہ کہاں ہے' استثنا کہاں ہے' تشریح مزید کہاں ہے' براہِ راست یہ کچھ کہاں کہاں کہا گیا ہے یا کسی واقعہ کے ضمن میں یہ کچھ کس کس جگہ ہے۔یہ تمام چیزیں بیک وقت سامنے آجائیں اور غور فرمایئے عزیزانِ من! کہ یہ مرحلہ پہلے سے بھی زیادہ دشوار گزار اور محنت طلب تھا۔میں نے اللہ کا نام لے کر اس تبویب یا انسائیکلو پیڈیا کا بھی آغاز کر دیا اور اس کے فضل و کرم سے اس میں اس طرح کامیاب ہوا کہ میری تبویب القرآن' قریباً دو ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی یہ کتاب شائع ہو کر بڑی ہی مقبول ہو چکی ہے۔ [2]

اب آپ سوچ لیجیے کہ قرآنِ کریم کے سمجھنے کے لیے جو کچھ میں نے کیا ہے' وہ کس قدر محنت طلب مرحلہ تھا۔ پہلے جس انداز سے سمجھا اور پھر اس کو سمجھانے کا جو انداز ہے' اس کے لیے لغات القرآن ہے یہ لغات القرآن صرف قرآنِ کریم کے الفاظ کے وہ معانی بتاتا ہے' جو زمانہ نزولِ قرآن میں عرب لیتے تھے' پھر ان معانی کی رو سے سارے کے سارے قرآن کا مفہوم مرتب کیا اور قرآن کے موضوعات کے متعلق اس قسم کی تبویب کا انسائیکلو پیڈیا ترتیب دیا کہ جو موضوع آپ کے سامنے آئے' آپ کو بیک وقت معلوم ہو کہ قرآن میں اس کے متعلق کیا کیا آیا ہے۔ان چیزوں کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کو صحیح طور پر سمجھنے کی کسی اور چیز کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

---

[1] قرآنی موضوعات کو تبویب کی شکل میں پیش کرنے کے موضوع کے متعلق مزید وضاحت کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء' ص ص 170 تا 171۔

[2] ان کی مزید تشریح و وضاحت کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان انتیسواں پارہ' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2006ء

قرآنِ حکیم پر غور و فکر کی شرط ہر دَور کے لیے لازم ہے

عزیزانِ من! ان دونوں شرطوں سے زیادہ اہم ایک اور شرط بھی ہے اور وہ ہے تدبر فی القرآن (4:82) یعنی قرآنِ کریم کے سمجھنے میں غور و فکر سے کام لینا۔ آپ قرآنِ کریم کے ورق الٹیے' قریب قریب ہر صفحہ پر آپ کو علم و بصیرت اور عقل و شعور سے کام لینے اور غور و فکر کرنے کی تاکید ملے گی۔ تدبر کا حکم نہ کسی خاص فرد کے لیے ہے' نہ کسی خاص زمانے کے لیے ہے' وہ تمام افراد کے لیے اور تمام زمانوں کے لیے ہے۔ اس لیے قرآن کو تقلیداً سمجھا ہی نہیں جا سکتا' نہ ہی کسی ایک فرد کا تدبر و تفکر دوسرے کے لیے سند اور حجت ہو سکتا ہے۔ یعنی اس طرح سے نہیں ہے کہ کسی خاص زمانے میں' کسی خاص فرد نے' جو قرآنِ مجید کی کوئی تفسیر لکھ لی' وہی ہمارے لیے بھی کافی ہو گئی۔ ایسا نہیں ہے۔ یہ ہر زمانے کے مسلمان کو' ہر زمانے کے انسان کو' دعوت دیتا ہے کہ وہ خود قرآنِ کریم پر غور و فکر کرے۔ اس لیے کسی ایک فرد کا تدبر اور تفکر دوسرے کے لیے سند اور حجت نہیں ہو سکتا۔

قرآنِ حکیم سے استفادہ کرنے والے کے لیے دقت کے تقاضوں سے آگاہ ہونا بھی ضروری ہو گا

قرآنِ کریم پر غور کرنے والے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے زمانے میں جس سطح تک علمِ انسانی پہنچ چکا ہے' اس پر اس کی نگاہ ہو۔ قرآن انسانی زندگی کے تقاضوں کا حل پیش کرتا ہے۔ اگر کسی کو یہ ہی معلوم نہ ہو کہ اس کے زمانے کے انسانی تقاضے کیا ہیں' تو وہ قرآن سے کیا رہنمائی حاصل کر سکے گا۔ اس سے یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے کہ جس طرح ایک فرد کا تدبر فی القران دوسرے کے لیے سند اور حجت نہیں ہو سکتا' اسی طرح جو کچھ قرآن کے متعلق کسی ایک زمانے میں سمجھا گیا ہو' وہ بھی حرفِ آخر نہیں ہو سکتا۔ جوں جوں علمِ انسانی بڑھتا جائے گا' نت نئے قرآنی حقائق واضح ہوتے چلے جائیں گے۔

قرآنِ حکیم کی کسی بات میں بھی تضاد نہیں ہے

اب آگے چلیے۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا ﴿۸۲﴾ (4:82) کیا ان لوگوں نے قرآن میں تدبر نہیں کیا؟ اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یہ لوگ اس میں کئی اختلاف پاتے۔ یعنی قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں کہیں اختلاف نہیں اور یہ چیز اس کے من جانب اللہ ہونے کی ایک دلیل ہے۔ ہمارے ہاں عام طور کہا جاتا ہے کہ قرآن کے الفاظ میں تو کوئی اختلاف نہیں یعنی جتنے بھی قرآن کے نسخے ہیں' ان میں متن (Text) ایک ہی جیسا ہے' اس میں کوئی اختلاف کی بات نہیں' کوئی اختلافی چیز نہیں۔ سب جگہ یہی الفاظ ہیں کہ اس میں تو کوئی اختلاف نہیں لیکن اس کی تعبیرات (Interpretations) مختلف ہو سکتی ہیں۔ آپ سوچیے کہ لفظی اختلافات کا نہ ہونا بھی کوئی ایسی خصوصیت ہے جس کا اس تحدی سے ذکر کیا جاتا؟ بات تو ساری تعبیرات کی ہے۔ اگر کسی کتاب کی عبارت کی کیفیت یہ ہو کہ وہ زید کو کوئی مفہوم دے اور بکر کو اس کے بالکل متضاد مفہوم' تو کیا اہلِ علم کے نزدیک اس کتاب کی کوئی وقعت ہو سکتی ہے؟ یاد رکھیے! قرآنِ حکیم کی کسی بات میں بھی تضاد نہیں ہے۔

قرآن حکیم پر تدبر مشروط ہوگا

قرآن سمجھنے کے لیے جو شرائط خود قرآن نے مقرر کی ہیں، اگر ان کے مطابق قرآن میں تدبر کیا جائے، تو اس کے کسی حکم کی دو تعبیرات (Interpretations) ہو ہی نہیں سکتیں۔ اس لیے اگر امت قرآن کو اپنی سمجھ اور حجت اور آخری دلیل تسلیم کرلے، تو امت میں کسی قسم کا تفرقہ اور اختلاف پیدا ہی نہیں ہوسکتا؟

اس مقام پر ایک نکتے کی وضاحت ضروری ہے۔ قرآنِ کریم میں کچھ تو احکام وقوانین دیئے گئے ہیں اور کچھ حقائق۔ احکام وقوانین کے لیے ایسے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، جن کے معانی متعین اور ٹھوس (Concrete) ہیں لیکن حقائق بالخصوص وہ حقائق، جن کا تعلق مابعد الطبیعات (Meta -Physics) سے ہے، انہیں تشبیہات کے انداز میں بیان کیا گیا ہے اور اہلِ علم سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ تشبیہات واستعارات سے ہر شخص اپنے اپنے فہم اور علمی سطح کے مطابق مشبہ بہ کے متعلق تصور قائم کرسکتا ہے۔ ان تصورات میں اختلاف ہوگا لیکن جہاں تک قرآنی ہدایت کا تعلق ہے، ان کی دو تعبیریں نہیں ہو سکتیں۔ یہ احکام وقوانین اسلامی نظام کی طرف سے نازل ہوں گے، اس لیے ان کی عملی جزئیات میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہو گا۔ یوں امت میں وحدت فی العمل پیدا ہوجائے گی اور قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لیے فکری آزادی بھی قائم رہے گی۔

قرآن فہمی کے سلسلہ میں شرط اول قلب ونگاہ کی بالیدگی ہے

عزیز برادران! ان تمام شرائط سے کہیں زیادہ گہری شرط ایک اور ہے اور وہ یہ ہے کہ جب تک اپنے ذہن کو پہلے سے قائم شدہ نظریات، معتقدات اور تصورات سے پاک نہیں کرلیا جائے گا، قرآن سمجھ میں نہیں آسکے گا۔ لَّا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَؕ (56:79) قرآنِ کریم کا واضح ارشاد ہے۔ یعنی ''جس کے قلب ونگاہ انسانی خیالات کی آمیزشوں سے پاک نہ ہوں، اسے قرآن سے کوئی مس نہیں ہوسکتا۔ انسانی قلب خدا کا مسکن بن نہیں سکتا جب تک اس حریم کعبہ سے انسانی فکر کے تراشیدہ بتوں کو نکال باہر نہ کیا جائے۔ جو شخص پہلے سے کوئی خیال قائم کرکے قرآن کی طرف اس لیے آتا ہے کہ اسے اپنے اس خیال کی کسی نہ کسی طرح تائید مل جائے، تو اسے قرآن کی بارگاہ سے بُری طرح پھٹکار پڑتی ہے۔ مفکر قرآن اقبالؒ (1877-1938) کے الفاظ میں:

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے!

قرآن فہمی کے سلسلہ میں اہل عرب کی کیفیت اور ہماری تقلید پرستی:

دماغ کو پہلے ان بتوں سے پاک کرنا چاہیے اور پھر دیکھیے کہ قرآنِ کریم کس طرح جلوہ پیرا ہوکر اس میں داخل ہوتا ہے! بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ اہلِ عرب کی زبان تو عربی ہے۔ وہ بھی قرآن کو صحیح طور پر کیوں نہیں سمجھ پاتے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ

بھی قرآن کو غیر عرب مسلمانوں کی طرح تقلیداً سمجھتے ہیں یعنی کسی زمانے میں، کسی شخص نے، جس طرح قرآن کو سمجھا اور وہ آنے والوں کے لیے سند اور حجت بن گیا۔ اس کے بعد یہ سوال ہی نہ رہا کہ قرآنِ کریم میں خود غور و فکر کیا جائے۔ یہ تقلیدی قرآن عربوں کو عربی زبان میں پڑھایا جاتا ہے اور غیر عربوں کو ترجموں کے ذریعے ان کی اپنی زبان میں۔ اپنی فکر سے نہ یہ قرآن کو سمجھتے ہیں، نہ وہ۔ اس لیے اس باب میں عرب اور عجم کی بھی کوئی تفریق نہیں رہی۔ تفسیر کی جو کتابیں الازہر میں پڑھائی جاتی ہیں، وہی دیوبند یا اب کراچی ملتان اور لاہور کے دارالعلوموں میں زیرِ تدریس رہتی ہیں۔ اپنی فکر و بصیرت نہ یہاں ہے، نہ وہاں۔

قرآنی رموز کو جاننے اور سمجھنے میں صدیوں سے حائل رکاوٹ:

قرآن سمجھنے کے لیے سوال اہلِ زبان ہونے کا نہیں ہے۔ سوال زبان دانی کے بعد اہلِ فکر و نظر ہونے کا ہے۔ اپنے غور و فکر اور علم و بصیرت کی رو سے قرآنِ کریم کو سمجھنے میں ایک بہت بڑی دشواری حائل ہوتی ہے۔ ہمارے اسلاف نے یعنی متقدمین نے جو تفسیریں لکھیں، اگر وہ ان کے متعلق یہ کہتے کہ یہ ان کا اپنا خیال ہے، اپنی رائے ہے، اپنا فہم ہے، تو ان سے اختلاف کی گنجائش ہو سکتی تھی۔ ایک انسان کے خیال سے دوسرا انسان اختلاف کر سکتا ہے۔ اس میں نہ کوئی گناہ کی بات ہے، نہ جرم کی بات لیکن ہوا یہ کہ انہوں نے جو تفسیر لکھی تو اس کے متعلق یہ کہا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی بتائی ہوئی تفسیر ہے۔ ہمارے ہاں سب سے پہلی قرآنِ کریم کی تفسیر امام طبریؒ [1] کی تفسیر کہلاتی ہے۔ وہ بھی نبی اکرم ﷺ کی وفات کے دو اڑھائی سو سال بعد تیسری صدی ہجری میں ہوئے ہیں۔ یہ پہلی مفصل قرآن کی تفسیر سمجھی جاتی ہے۔ پھر انہوں نے کیا یہ ہے کہ ہر آیت کی تفسیر کے متعلق لکھا یہ ہے کہ یہ نبی اکرم ﷺ کی بیان فرمودہ تفسیر ہے۔ تب ہوا یہ کہ وہ طبری کی تفسیر نبی اکرم ﷺ کی ارشاد فرمودہ تفسیر قرار پا گئی اور اس کے بعد آپ سوچیے کہ کس کی جرأت ہے کہ اس سے اختلاف کر سکے۔ جس تفسیر کے متعلق کہا جائے کہ وہ نبی اکرم ﷺ کی ارشاد فرمودہ ہے، تو پھر وہ کون مسلمان ہے جو اس کے خلاف کوئی ایک لفظ بھی کہہ سکنے کی جرأت کر سکے۔ چنانچہ اس کے بعد آج تک جتنی تفسیریں لکھی گئیں، ان میں الفاظ کا فرق ہوگا، اندازِ بیان کا فرق ہوگا، اسلوب کا فرق ہوگا، تفصیل کا فرق ہوگا لیکن بنیادی طور پر معنویت کے اعتبار سے اس سے کوئی اختلاف نہ کر سکتا تھا، نہ کسی نے کیا ہے۔

امام طبریؒ اور امام بخاریؒ کی محنت کے ماحصل کا نتیجہ

یہ ساری تفسیریں جو ہزار سال کے زمانے میں لکھی گئی ہیں، یوں کہیے کہ امام طبریؒ کی تفسیر پر طرحی غزلیں ہیں، لیکن میں ابھی عرض کروں گا کہ وہ جو آیات کی تفسیر انہوں نے لکھی ہیں، وہ نبی اکرم ﷺ کی نہیں ہیں، وہ روایات پر مبنی ہیں اور روایات کے متعلق میں ابھی عرض کروں گا کہ وہ کس طرح سے وجود میں آئیں اور ان کے متعلق کوئی شخص بھی یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ وہ فی الواقع نبی اکرم ﷺ کی ہیں۔ صورت تو یہ ہوئی لیکن اس سے امت کو جو نقصان پہنچا، وہ یہ ہے کہ ہزار سال پہلے طبرستان

---

[1] ان نکات کی وضاحت کے لیے دیکھیے: مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ بنی اسرائیل، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2004ء، ص ص 30 تا 31 نیز فٹ نوٹ 1

کے رہنے والے ایک امام طبریؒ تھے اور دوسرے امام بخاریؒ (194-260ھ)' وہ بھی بخارا کے ہی رہنے والے تھے۔انہوں نے حدیث کا مجموعہ مرتب کیا اور امام طبری نے پہلی تفسیر مرتب کر دی۔ دونوں روایات پر مبنی ہیں' دونوں میں سے کسی کے متعلق بھی یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی ہیں۔

طبری رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کے متعلق اختلاف کی ذرا سی گنجائش نکل سکتی تھی اگر نبی اکرم ﷺ کے زمانے کی صحیح' یقینی تاریخ ہمارے پاس موجود ہوتی' لیکن وہ بھی ہمارے پاس نہیں ہے۔امام طبریؒ نے جہاں قرآن کی تفسیر لکھی' وہیں اس زمانے کی تاریخ بھی لکھ دی:تفسیر تیس جلدوں میں' تاریخ تیرہ جلدوں کے اندر اور اس میں بھی ایک سند نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کبار کی ہے۔اب اس تاریخ سے بھی کوئی اختلاف نہیں کر سکتا۔انہوں نے کیا یہ کہ جو تفسیر دی' اس تفسیر کی تائید میں تاریخی واقعہ لکھ دیا' جو تاریخی واقعہ لکھا اس کی تائید میں ایک تفصیلی روایت لکھ دی' تو اب اس کے بعد آپ کے ہاں نبی اکرم ﷺ کے زمانے کی' ان کے عقیدے کے مطابق' قرآن کی تفسیر بھی مرتب ہو گئی اور اس دور کی تاریخ بھی مرتب ہو گئی۔اب اس تفسیر سے کوئی اختلاف نہیں کر سکتا' اس تاریخ سے بھی کوئی اختلاف نہیں کر سکتا۔اس ہزار سال میں جس طرح سے اسلام کی یہ گاڑی اصلی پٹڑی سے دوسری پٹڑی پہ جا کے پڑ گئی ہے اُس میں بنیادی طور پر جو ذمے داری عائد ہوتی ہے' جو بنیادی سبب ہے' وہ یہی تفسیر' یہی تاریخ ہے' اسی نہج پر ہر ایک نے تفسیر لکھی تو اس کے بعد' جیسا کہ میں ابھی عرض کروں گا' کہ یہ جو روایات کی بنیادوں کے اوپر تفسیر یا تاریخ کہی جاتی ہے' یہ جو امت کے اندر اتنا زیادہ اختلاف پیدا ہو رہا ہے' اس کی بنیاد ہی یہ ہے۔

نبی اکرم ﷺ پہ قرآنِ کریم نازل ہوا۔یہ ظاہر ہے کہ جس انداز سے حضور قرآن کریم کو سمجھ سکتے تھے' اس سے بہتر تو ایک طرف' اس سے الگ کون سا مسلمان قرآن کو سمجھ سکتا تھا' اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ جو تفسیر ہے اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ احادیث کے اندر ہے۔اب احادیث کی صورت یہ ہے کہ نہ تو نبی اکرم ﷺ نے اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب کر کے دیا اور نہ ہی صحابہ کبار نے کوئی مجموعہ مرتب کیا۔احادیث کے پہلے مجموعے نبی اکرم ﷺ کی وفات کے ڈھائی تین سو سال بعد جا کر مرتب ہوئے اور یہ کسی پہلے سے Written Material (تحریری مواد) پر مبنی نہیں ہیں' کسی تحریری سند یا مواد پر مبنی نہیں ہیں' بلکہ سب زبانی روایات پر مبنی ہیں۔امام بخاریؒ نے زبانی روایت کو اپنے مجموعۂ حدیث میں شامل کر لیا۔جن حدیث کی چھ کتابوں کو سنیوں [1] کے ہاں صحیح ترین قرار دیا جاتا ہے' ان سب میں سرِ فہرست امام بخاریؒ کا مجموعہ ہے۔انہوں نے لکھا ہے کہ ''میں نے جب احادیث جمع کرنی شروع کیں' تو چھ لاکھ کے قریب روایات میں نے لوگوں سے سنیں۔ان میں سے میں نے پانچ لاکھ چورانوے ہزار کو تو خود اپنی صوابدید کے مطابق مسترد کر دیا' تو قریب چھ ہزار احادیث یا روایات رکھیں۔ان میں سے بھی اگر جو مکرر بیان کی گئی ہیں' کو الگ کر دیا جائے' تو وہ قریباً تین ہزار رہتی ہیں''' لیکن یہ جو تین ہزار رہتی

---

[1] ان نکات کی وضاحت کے لیے دیکھیے: مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ بنی اسرائیل' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء' ص ص 199 تا 218، نیز فٹ نوٹ 1`2(200)۔

ہیں، ان میں بھی تو کسی روایت کو نہ نبی اکرم ﷺ کی سند ہے، نہ صحابہ کبار کی کوئی تصدیق ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ امام بخاری نے کسی سے سنا، انہوں نے اپنے باپ سے سنا، انہوں نے اپنے استاد سے سنا، انہوں نے فلاں سے سنا، انہوں نے فلاں سے سنا، انہوں نے فلاں صحابی سے سنا، تو انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا تھا۔ ہر حدیث کا یہ انداز ہے۔

آپ سوچیے، عزیزانِ من! کہ نبی اکرم ﷺ کی وفات کے دو اڑھائی سو سال بعد اس انداز سے، ان اسباب کے ذریعے سے، کہ فلاں نے فلاں سے سنا تھا، جو روایت بیان کی جائے گی، اس میں کہاں تک یقینی طور پر کہا جائے گا، کہ وہ رسول اللہ کی ہے۔ اسی لیے یہ جتنی حدیثیں ہیں، ان میں سے ہر حدیث کے بعد پہلے کہا جاتا ہے کہ ''قال رسول اللہ''۔ حضور نے فرمایا اور آخر میں کہا جاتا ہے ''اوکما قال رسول اللہ'' یا جیسے رسول اللہ نے فرمایا ہے۔ یعنی خود یہ لوگ بھی یقینی طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ جو کچھ ہم بیان کر رہے ہیں، یہ رسول اللہ کی کہی ہوئی ہیں اور پھر یہ رسول اللہ کے الفاظ بھی نہیں ہے۔ حدیث کہتے ہیں کہ وہ معنوی طور پر آگے آئیں، یعنی ایک شخص نے یہ سمجھا، اُس نے آگے سمجھایا، اُس نے یہ سمجھا، اُس نے آگے سمجھایا اور دو سو سال کے بعد وہ شخص جس نے بیان کیا، اسے امام بخاریؒ نے اپنی کتاب میں لکھ لیا۔ اس طرح سے یہ احادیث کی چھ مستند کتابیں تو سنیوں کے ہاں ہیں اور اسی قسم کی چار مستند کتابیں شیعہ حضرات کے ہاں ہیں ❶ اور کیفیت یہ ہے کہ ایک کتاب دوسری کتاب سے مختلف ہے یعنی خود ایک کتاب کے اندر بہت سے اختلافات ہیں۔ یہ ہیں عزیزانِ من! احادیث کے وہ مجموعے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان میں درج وہ احادیث رسول اللہ کی بیان فرمائی ہوئی ہیں۔

احادیث کے متعلق امام احمد بن حنبل کا فرمان

یہ اس قدر نا قابل اعتماد ہے کہ ان احادیث کے متعلق امام احمد بن حنبل ؒ(164-241H/780-855AD) کا قول ہے کہ احادیث کی کتابوں میں تین قسم کی روایات قابل اعتماد نہیں: پیشین گوئیوں سے متعلق، لڑائیوں سے متعلق، اور تفسیر سے متعلق۔

ان کے اس قول کی تصدیق خود ان تفاسیر سے ہوتی ہے جنہیں نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ مثالیں تو میں، اس میں بے شمار دے سکتا ہوں، لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے میں اس وقت اس کی صرف دو ایک مثالیں نہیں بلکہ ایک ہی مثال دینا کافی سمجھتا ہوں۔ وہ پیش کروں گا۔ آپ اس سے اندازہ لگا لیجیے گا کہ روایات کی رو سے قرآنِ کریم کے سمجھنے میں کتنی مدد مل سکتی ہے۔

سورۂ احزاب میں ہے یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا (33:69)۔ جماعت مومنین سے کہا جا رہا ہے کہ اے ایمان والو! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے موسیٰ کو بہت ستایا، انہیں اذیت دی، تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو ان کی ان اذیت رسانیوں سے محفوظ رکھا۔ تم ان کی طرح نہ ہو جانا۔ بنی اسرائیل حضرت

❶ اس کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے:: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ حج، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2005، ص ص۔ 242-200۔

موسیٰ علیہ السلام کو کس کس انداز سے ستاتے تھے' اس کی تفصیل قرآنِ کریم کے متعدد مقامات میں موجود ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس غلام محکوم قوم کو فرعون ❶ جیسے مستبد حاکم کی غلامی سے نجات دلا کر' وادیٔ سینا میں لے آئے تھے۔ یہی احسان کچھ کم گراں بہا نہیں تھا۔ اس قوم کو چاہیے تھا کہ قدم قدم پر ان کے شکر گزار ہوتے لیکن ان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ قدم قدم پر ان کو اذیت دیتے' ان کو تنگ کرتے۔

راستے میں ایک جگہ دیکھا کہ ایک قوم ایک بت کی پرستش کرتی ہے' تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دامن پکڑ کر بیٹھ گئے کہ ہمیں بھی ایسا ایک بت بنا دیجیے تاکہ ہم اس کی پرستش کریں۔ کبھی ان کی کیفیت یہ ہے کہ پانی کی تنگی ہوئی ہے' تو جدھر گئے ہیں' انہوں نے کہا کہ موسیٰ ؑ تم ہمیں کہاں مارنے کے لیے لے آئے ہو۔ وہاں ان کو من و سلویٰ کھانے کو ملتا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ہمیں تو یہاں بیٹھے ہوئے مصر میں' جو ہم اس قوم کی' اپنی حاکم قوم کی' ہنڈیاں پکایا کرتے تھے' اس کی لذتیں یاد آتی ہیں۔ ہمیں دالیں اور پیاز اور لہسن اور سبزیاں' یہ کچھ دو۔ یہ من و سلویٰ یہ ہم سے روز روز نہیں کھایا جاتا۔

آپ علیہ السلام چند دن کے لیے ذرا کہیں باہر گئے' سامری ❷ نے ایک گئو سالہ بنایا اور انہوں نے اس کی پرستش شروع کر دی۔ وہ اس طرح ایک ایک قدم پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ستایا کرتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ان سے کہا کہ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ (61:5)۔ اے قوم! میں نے تمہارے ساتھ کون سی دشمنی کی ہے جس کی وجہ سے تم مجھے قدم قدم پر اس طرح ستاتے ہو حالانکہ تم جانتے ہو کہ میں تمہاری طرف خدا کا رسول ہوں' اس کے پیغامات تم تک پہنچاتا ہوں' تمہیں تو اس کے لیے احسان مند ہونا چاہیے تھا لیکن تمہاری کیفیت یہ ہے کہ ایک ایک قدم پر مجھے تنگ کرتے ہو' اذیتیں پہنچاتے ہو' اسی لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے فریاد کی تھی کہ اے اللہ! میں اور میرا بھائی بس ہم یہ دونوں ہیں' جو اپنے ذمے دار ہیں' ورنہ یہ قوم فاسق ہے۔ جو کچھ یہ کر رہی ہے اس کی ذمے داری ہم پہ عائد نہیں ہوتی۔

میں نے یہ تفصیل اس لیے بیان کی کہ یہ معلوم ہو جائے کہ وہ جو قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ اے جماعت مومنین! تم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی طرح نہ ہو جانا' انہوں نے انہیں بڑا ستایا تھا اور ان کی اذیت رسانیوں کی تفصیل خود قرآن نے دی ہے' اس کی وضاحت ہو جائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق ایک روایت

اب آپ دیکھیے کہ اس آیت کی تفصیل روایات کی رو سے کیا ملتی ہے؟ یہ بخاری شریف کی روایت ہے۔ غور سے سنیے گا'

❶ اس کشمکش کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورۃ طٰہٰ' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء

❷ بچھڑے (گئو سالہ) اور سامری کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان، سورۃ طٰہٰ' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء ص ص 242 اور 250 اور فٹ نوٹ 1 (250)۔

عزیزانِ من! حضرت ابوہریرہ ؓ نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل برہنہ غسل کرتے تھے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھا جاتا تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام تنہا غسل کیا کرتے تھے۔

بنی اسرائیل نے کہا کہ واللہ! موسیٰ علیہ السلام کو ہم لوگوں کے ہمراہ غسل کرنے سے سوا اس کے کچھ مانع نہیں کہ وہ...... کے مرض میں مبتلا ہیں۔ اتفاق سے ایک دن موسیٰ علیہ السلام غسل کرنے گئے اور اپنا لباس پتھر پر رکھ دیا۔ وہ پتھر ان کا لباس لے بھاگا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اس کے تعاقب میں یہ کہتے ہوئے دوڑے کہ اے پتھر! میرے کپڑے دے دے' اے پتھر! میرے کپڑے دے دے' یہاں تک کہ بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف دیکھ لیا اور کہا واللہ! موسیٰ علیہ السلام کو کچھ بیماری نہیں ہے اور پتھر ٹھہر گیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنا لباس لے لیا اور پتھر کو مارنے لگے۔ ابوہریرہ ؓ کہتے ہیں کہ خدا کی قسم! حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مار سے چھ یا سات نشان اب تک اس پتھر پر داخل ہیں۔

عزیز برادران! یہ بخاری شریف کی جلد اول کی روایت ہے جو قرآنِ کریم کی اس آیت کی تفسیر میں بیان کی گئی ہے جس میں قرآنِ کریم نے جماعت مومنین سے کہا تھا کہ تم قوم موسیٰ کی طرح نہ ہو جانا۔ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بہت ہی اذیتیں دی تھیں۔ اس روایت یا اس حدیث کے اندر اس اذیت رسانی کی تفسیر بیان ہو رہی ہے۔ کس قسم کی ہیں وہ تفاسیر جو احادیث کے اندر ہمیں ملتی ہیں۔ عزیزانِ من! ان کا آپ خود اندازہ لگا لیجیے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ قرآنِ کریم کی تفسیر روایات کی رو سے کی جانی چاہیے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ حالانکہ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ یہ روایات یا احادیث رسول اللہ ﷺ کی نہیں ہیں۔ یہ آپ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں اور زبانی روایتیں کوئی دوسو اڑھائی سو سال کے بعد جمع کی گئی تھیں۔ اب کوئی نہیں کچھ کہہ سکتا کہ ان میں کتنا حصہ حضور ﷺ کا ہے اور کتنا کچھ دوسروں کا ملایا ہوا ہے۔

احادیث کے مجموعوں کے متعلق میرا مسلک یہ ہے کہ ان میں جو باتیں قرآن کے مطابق ہیں' انہیں ہم صحیح تسلیم کر سکتے ہیں لیکن جو قرآن کے خلاف ہیں یا جن سے حضور ﷺ کی ذاتِ گرامی پر کسی قسم کا طعن پڑتا ہے' ان کے متعلق ہم کہہ دیں گے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی حدیثیں نہیں ہو سکتیں۔

پھر سن لیجیے کہ میں رسول اللہ ﷺ کی کسی حدیث کا انکار نہیں کرتا۔ متذکرہ بالا مواد کی رو سے غلط روایات کے متعلق کہتا یہ ہوں کہ وہ رسول اللہ کی ہو نہیں سکتیں' ورنہ جو احادیث قرآنِ کریم کی تعلیم کے مطابق ہیں' میں نے کبھی بھی اور کہیں بھی ان کا انکار نہیں کیا۔

عزیزانِ من! یہ ہیں سورۃ الفاتحہ کے ان دروس کے اسباب جو آپ کے سامنے پیش کیے گئے اور یہی ہے ان کی پہلی تعارفی نشست۔ اب سورۃ الفاتحہ ہم اگلے درس میں لیں گے۔

علامہ محمد اقبالؒ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سرمایہ و محنت

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا، ہے یہ پیامِ کائنات

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کا زکات

ساحرِ الموط نے تجھ کو دیا برگِ حشیش
اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخِ نبات

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کے بنائے مُسکرات

کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لیے
سُکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقدِ حیات

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

ہمتِ عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول
غنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک

نغمۂ بیداریِ جمہور ہے سامانِ عیش
قصۂ خواب آورِ اسکندر و جم کب تلک

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں! ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام
دُوریِ جنت سے روتی چشمِ آدم کب تلک

باغبانِ چارہ فرما سے یہ کہتی ہے بہار
زخمِ گل کے واسطے تدبیرِ مرہم کب تلک

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو

پرویز علیہ الرحمۃ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

گذشتہ سے پیوستہ

قرآن کا تصورِ حکومت

اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ کا مفہوم کیا ہے

مرض، تشخیص اور علاج

(ایک جامع مقالہ جس سے اسلامی حکومت کا تصور اور نقشہ نکھر کر سامنے آجاتا ہے)

علامہ ابوبکر خطیب بغدادیؒ نے اپنی کتاب ''کفایہ'' میں لکھا کہ:

''حضرت مقدام بن معدی کربؓ نے فرمایا کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ یادرکھو! میں کتاب دیا گیا ہوں اور اس کے ساتھ اس کی مثل اور بھی یادرکھو! میں کتاب دیا گیا ہوں اور اس کے ساتھ اس کی مثل اور بھی یادرکھو! عنقریب ایک شخص جس کا پیٹ بھرا ہوگا اپنے تخت پر بیٹھا ہوا کہے گا کہ لازم پکڑ لو اسی قرآن کو جو کچھ اس قرآن میں حلال پاؤ اس کو حلال سمجھو اور جو کچھ اس میں حرام پاؤ اسے حرام سمجھو۔''

قطع نظر اس کے کہ جو کچھ اس شخص کی طرف منسوب ہے قرآن کی رو سے حقیقت وہی ہے، اس روایت کے الفاظ بالبداہت کہہ رہے ہیں کہ یہ الفاظ حضور ﷺ کے نہیں ہو سکتے۔ حضور ﷺ کی لطافت، ذوق، شائستگی ومزاجِ حسنِ تکلم کے شایانِ شان ہی نہیں کہ آپ ﷺ اس قسم کے استہزاء آمیز الفاظ استعمال فرماتے۔۔۔ طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت دسمبر 1952ء میں، اس روایت کی اسناد کا تجزیہ کر کے بتایا گیا ہے کہ یہ قطعاً وضعی ہے۔

اس روایت کی رو سے، روایات کو قرآن کی مثل قرار دینے کے بعد دل میں یہ کھٹک پیدا ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے تو تمام نوعِ انسان کو چیلنج دیا تھا کہ اس قرآن کی ایک سورۃ کی مثل لا کر دکھاؤ تو یہ روایات قرآن کی مثل کیسے ہو سکتی ہیں؟

اس کے جواب میں ایک اور عقیدہ وضع کیا گیا کہ احادیث بھی وحی ہیں۔ وحی کی دو قسمیں ہیں ایک وحی متلو جس کی تلاوت کی جاتی ہے اور دوسری وحی غیر متلو، جس کی تلاوت نہیں کی جاتی یہ احادیث ہیں۔ (یہ عقیدہ یہودیوں کا تھا) قرآن میں کہیں بھی وحی کی دو قسمیں نہیں بتائی گئیں اس کی رو سے وحی کی ایک ہی قسم ہے اور وہ قرآن کے اندر مذکور ومحفوظ ہے۔

مولانا محمد اسماعیل مرحوم (سابق صدر جمعیت اہل حدیث) اپنے رسالہ ''جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث'' میں لکھتے ہیں۔

تحقیق وتثبیت کے بعد حدیث کا ٹھیک وہی مقام ہے جو قرآن عزیز کے انکار کا ___ جو احادیث قواعد صحیحہ اور ائمہ سنت کی تصریحات کے مطابق صحیح ثابت ہوں ان کا انکار کفر ہوگا اور ملت سے خروج کے مرادف۔

(جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث، ص:48)

بخاری اور مسلم کے مجموعوں کے متعلق آپ ارشاد فرماتے ہیں:

بخاری اور مسلم کی احادیث کی صحت پر امت متفق ہے ___ ان احادیث کی صحت قطعی ہے۔

(ایضاً، ص:55)

بالفاظ دیگر، مولانا اسمٰعیل (مرحوم) کے نزدیک، بخاری اور مسلم کی کسی حدیث کے انکار کا وہی اثر ہے جو قرآن عزیز کے انکار کا ہے۔ ان احادیث کا انکار کفر ہے اور ایسا کرنے والا مسلمانوں کے گروہ سے خارج ہوجاتا ہے۔ آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

جبرائیل قرآن اور سنت دونوں کو لے کر نازل ہوتے تھے۔ آنحضرتؐ سنت بھی قرآن کی طرح سکھاتے تھے۔ اس لحاظ سے ہم وحی میں تفریق کے قائل نہیں۔

(ایضاً، ص:60)

جب وحی میں تفریق نہ رہی، اور قرآن اور حدیث میں مذکور وحی ایک ہی قرار پا گئی، تو مولانا مسعود احمد صاحب نے بات کھل کر کہہ دی کہ حدیث کو کتاب اللہ کہا جاتا ہے۔

(تفہیم اسلام، ایڈیشن 1967ء، ص:72، شائع کردہ اہل حدیث اکادمی، لاہور)

لیکن دونوں کتابیں (قرآن اور حدیث) ہم پایہ نہیں حدیث کا مقام قرآن سے بلند ہے امام اوزاعیؒ کا قول ہے قرآن اس سے زیادہ حدیثوں کا محتاج ہے جس قدر حدیثیں قرآن کی محتاج ہیں۔

(مختصر جامع بیان العلم، ص:223)

ایک اور امام حدیث یحییٰ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:

حدیث قرآن پر قاضی ہے، قرآن حدیث پر قاضی نہیں۔ (ایضاً)

''قاضی'' کے معنی یہ ہیں کہ اگر قرآن اور حدیث میں تضاد واقعہ ہو۔ (اور ایسا اکثر ہوتا ہے) تو فیصلہ حدیث کا قابل تسلیم ہوگا نہ کہ قرآن کا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ عقیدہ تھا کہ حدیث قرآن کو منسوخ کرسکتی ہے۔ علامہ حافظ محمد ایوب (مرحوم) اپنے کتابچہ ''فتنۂ انکارِ حدیث'' میں لکھتے ہیں۔

نبیؐ کے قول کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ قرآن کے مطابق ہوتب تو حجت رہے اور مطابق نہ ہوتو حجت نہ رہے ___ جس طرح قرآن کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ہماری عقل کے مطابق ہوتو حجت ہو اور ہماری عقل کے مطابق نہ ہوتو حجت نہ ہو اسی طرح نبیؐ کے قول کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ قرآن کے مطابق ہوتو

حجت ہو اور قرآن کے مطابق نہ ہو تو حجت نہ ہو۔ (ص:82)

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:

رہی یہ بات کہ قول رسول ﷺ، قرآن کے خلاف ہو تو بھی وہ حجت ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرہ الوصیہ للوالدین (2:180) ''تمہارے او پر والدین کے لیے وصیت فرض ہے۔ اگر کسی نے مال چھوڑا ہے جبکہ اسے موت آئے۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لا وصیتہ للوارث۔'' وارث کے لئے وصیت نہیں ہے۔'' اور تواتر سے ثابت ہے کہ عمل اسی حدیث پر رہا ہے یعنی وارث کے لیے وصیت ناجائز قرار دی گئی حدیث نے قرآن کو منسوخ کر دیا اور قول رسول ﷺ، قرآن کی آیت کے خلاف حجت اور موجب عمل رہا۔ (ص:85)

اس کے بعد وہ اس کی علت سمجھاتے ہیں۔

اب اگر یہ کہا جائے کہ سمجھ نہیں آتا کہ رسول ﷺ کا کوئی قول قرآن کے خلاف ہو اور رسول ﷺ کا قول قرآن کو نسخ کر دے تو پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ رسول ﷺ کا قول اپنا قول نہیں ہوتا وہ درحقیقت خدا کا قول ہوتا ہے جس طرح قرآن خدا کا قول ہے اسی طرح رسول ﷺ کا قول بھی خدا کا قول ہے اور جس طرح قرآن کی ایک آیت دوسری آیت کو منسوخ کر دیتی ہے اسی طرح خدا کا ایک قول (یعنی قول رسول ﷺ) دوسرے قول یعنی قرآن کو منسوخ کر دیتا ہے۔ (ص:86)

جن آیات کو حدیث منسوخ کر دیتی ہے (ان حضرات کے عقیدے کی رو سے) ان کی تلاوت باقی رہتی ہے اور حکم منسوخ ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں آپ اس آیت کو ایک بار پھر سامنے لائیے جس کا ایک حصہ پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔ مخالفین نے حضور ﷺ سے کہا کہ اگر آپ ﷺ قرآن میں کچھ تبدیلی کر دیں تو ہم آپ ﷺ سے مفاہمت کر لیں گے اس کے جواب میں خدا کا ارشاد ہوا۔

قل مایکون لی ان ابدلہ من تلقائی نفسی ان اتبع الا مایوحی الی انی اخاف عصیت ربی عذاب یوم عظیم (10:15)

اے رسول (ﷺ)! ان سے کہہ دو کہ میں اپنی طرف سے قرآن میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا میرا منصب تو وحی خداوندی کا اتباع کرنا ہے اور بس اگر میں اس کی خلاف ورزی کروں تو میں بھی مواخذہ خداوندی سے بچ نہیں سکتا میں اس مواخذہ سے ہمیشہ ڈرتا ہوں۔

آپ نے غور فرمایا کہ جس رسول ﷺ کا اعلان یہ ہو کیا وہ قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کرنے کا خیال تک بھی دل میں لا سکے گا؟ خود (حدیث کی اہم کتاب) مشکوٰۃ میں یہ روایت موجود ہے کہ:

حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے کہ میرا کلام، کلام اللہ کو منسوخ نہیں کرتا اور کلام اللہ میرے کلام کو منسوخ کردیتا ہے۔ (مشکوٰۃ، جلد اوّل، کتاب اعتصام الکتاب وسنت)

لیکن اس کے باوجود، ان حضرات کا یہی عقیدہ اور عمل ہے کہ حدیث، قرآن کو منسوخ کرسکتی ہے۔

عام طور پر (عوام کو مطمئن کرنے کے لئے) کہا جاتا ہے کہ حدیث صرف قرآن کے مجمل احکام کی تفسیر اور تشریح بیان کرتی ہے۔ اس کا اتنا ہی فریضہ ہے لیکن مودودی صاحب (مرحوم) کا ارشاد ہے کہ یہ غلط ہے۔

حدیث کے مستقل ماخذ ہونے کی نفی سے اگر مراد یہ ہے کہ اس کی حیثیت صرف شارح اور مفسر کی ہے یعنی وہ انہی مسائل وقائع کی وضاحت کرتی ہے جن کا مجملاً قرآن میں ذکر آ گیا ہے اور خود اس کی اپنی مستقل حیثیت کچھ نہیں ہے تو یہ دعویٰ واقعہ کے خلاف ہے ــــ مسائل واحکام کے باب میں حدیث ایک مستقل ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

(ترجمان القرآن، جولائی، اگست، ستمبر 1950ء)

شروع شروع میں جب احادیث کو پرکھنے کے معیار مقرر کئے گئے تو ان کے سرفہرست یہ معیار تھا کہ جو حدیث قرآن کے مطابق ہو وہ صحیح ہے۔ جو اس کے خلاف ہو وہ مسترد کردینے کے قابل۔ لیکن اس سے ایک مشکل پیدا ہوگئی احادیث کی کتابوں میں جہاں ایسی روایات ہیں جو ایک دوسرے کے خلاف ہیں، وہاں ایسی روایات بھی ہیں جو خود قرآن کے خلاف ہیں۔ لیکن (جیسا کہ مولانا محمد اسماعیل مرحوم نے کہا تھا) بخاری اور مسلم کی تو کسی ایک حدیث کے انکار سے بھی مسلمان دائرہ اسلام سے خارج ہوجاتا ہے۔ ان احادیث کو جو قرآن کے خلاف ہیں، ان کتابوں سے نکال دینے کی جرأت کون کرسکتا ہے؟ اس مشکل کے حل کے لئے کہہ دیا کہ یہ معیار (کہ جو حدیث قرآن کے مطابق ہو وہی صحیح ہے) سرے سے غلط ہے۔ جماعت اہل حدیث کے ترجمان، الاعتصام (لاہور) کی 23 جنوری 1970ء کی اشاعت میں حسب ذیل شذرہ شائع ہوا تھا۔

دسمبر 1965ء کے رسالہ ''فکر ونظر'' راولپنڈی میں لکھا گیا ہے کہ ''حضور ﷺ نے فرمایا:

اذاروی عنی حدیث فاعرضوہ علیٰ کتاب اللہ فان وافقہ فاقبلوہ والا تذروہ(؟) جب کوئی حدیث میری نسبت بیان کی جائے تو اس کا مقابلہ کتاب اللہ سے کرو اگر قرآن کے حکم کے مطابق ہو تو قبول کرو ورنہ اسے چھوڑ دو۔''

''واضح رہے کہ یہ بات جو مقالہ نگار نے لکھی ہے صحیح نہیں واقعہ یہ ہے کہ جس زمانے میں یہ حدیث گھڑ کر رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کی گئی تھی اسی دور میں ماہرین فن حدیث آئمہ کرام نے ببانگ دہل اعلان کردیا تھا کہ یہ ہرگز فرمانِ رسول (ﷺ) نہیں۔

یعنی یہ کہنا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ میری طرف منسوب روایات کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھو جو اس کے مطابق ہو

اسے صحیح سمجھو جو اس کے خلاف ہو اسے غلط سمجھو، زندیقوں کا مسلک ہے! اہل تقویٰ کا مسلک یہ ہے کہ جو روایت قرآن کے خلاف ہو اسے صحیح سمجھو! یاللعجب ۔۔۔

اور اس تضاد کو اس طرح مٹاؤ کہ قرآن کی آیت کو منسوخ سمجھو۔

آپ نے غور فرمایا کہ ''وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ '' کا یہ مفہوم ہمیں کھینچ کر کہاں لے آیا؟ یعنی اب دین نام رہ گیا ان روایات کا جو دو سو سال تک زبانی کلامی بیان ہوتی رہیں اور جنہیں پھر جامعین حدیث نے اپنے قیاس کے مطابق تسلیم کیا ان روایات نے کتاب اللہ کی جگہ لے لی!

سنت:

تشکیل پاکستان کے بعد، ان علماء اور جماعتوں نے (بالخصوص) جنہوں نے مطالبہ پاکستان کی آخر دم تک مخالفت کی تھی، تقاضا شروع کر دیا کہ پاکستان کو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے اس لئے یہاں اسلامی قوانین نافذ کروان سے کہا گیا کہ یہاں مختلف فرقوں کے لوگ بستے ہیں اور علماء میں بھی باہمی اس قدر اختلاف ہے، تو اس صورت میں اس قسم کا ضابطہ قوانین کس طرح مرتب کیا جا سکے گا جسے سب (متفقہ طور پر) اسلامی تسلیم کر لیں کافی ردوکد کے بعد، 1951ء میں، مختلف فرقوں کے نمائندوں پر مشتمل اکتیس علماء کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں یہ ریزولیوشن پاس کیا گیا کہ:

1۔ شخصی قوانین ہر فرقہ کے اپنی اپنی فقہ کے مطابق ہوں اور

2۔ ملکی قوانین (پبلک لاز) کتاب وسنت کے مطابق ہوں۔

یہ ریزولیوشن (یا منشور) پاس کر کے انہوں نے پراپیگنڈہ شروع کر دیا کہ دیکھ لیجئے! تمام علماء اس مطالبہ پر متفق ہو گئے ہیں۔ اگر اب بھی حکومت اسلامی قوانین مرتب اور نافذ نہیں کرتی تو یہ اس کی بدنیتی اور بددیانتی ہوگی حکومت نے پراپیگنڈہ کے اس طوفان سے بچنے کے لئے اسے آئین میں شامل کر دیا۔

اس متفق علیہ مطالبہ کا ذرا تجزیہ کر کے دیکھئے سب سے پہلے یہ پوچھئے کہ اسلامی قوانین کو پرسنل لاء اور پبلک لاز میں تقسیم کرنے کے لئے اتھارٹی کونسی ہے؟ قرآنِ کریم میں اس قسم کی تفریق وتخصیص کا شائبہ تک نظر نہیں آتا نہ ہی صدر اوّل میں اس کا کوئی نشان ملتا ہے۔ یہ خالصتاً عہد ملوکیت کی ایجاد ہے جسے انگریزوں نے بھی یہاں برقرار رکھا تھا۔

دوسرے یہ کہ شخصی قوانین ہر فرقہ کے الگ الگ ہوں گے اس سے اس فرقہ بندی کو آئینی سند حاصل ہوگئی جسے قرآنِ کریم نے بہ نص صریح شرک قرار دیا ہے۔

> جس نے حدیث کے بیشتر ذخیرہ کا گہرا مطالعہ کر کے احادیث کو پرکھنے کی نظر بہم پہنچائی ہو کثرت مطالعہ اور ممارست سے انسان میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہوجاتا ہے جس سے وہ رسول اللہ ﷺ کا مزاج شناس ہوجاتا ہے ___ اس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جواہر کی

نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے ___ اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد وہ اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلے کا مدار اس پر نہیں ہوتا وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی نظر افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت کو دیکھ لیتی ہے اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل، غیر شاذ، متصل السند، مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس جام زریں میں جو بادہ معنی بھری ہوئی ہے وہ اسے طبیعت اسلام اور مزاج نبوت کے مناسب نظر نہیں آتی۔

(تفہیمات، حصہ اوّل، ص:302 تا ص:324)

لیجئے! اس ''سنت'' کا تعین ہو گیا جس کا اتباع دین ہے۔ یعنی پہلے تو جامعین احادیث (امام بخاریؒ) وغیرہ نے ان لاکھوں روایات میں سے جو انہیں ملیں، اپنے قیاس کے مطابق کچھ روایات الگ کر لیں اور انہیں احادیث رسول اللہ ﷺ قرار دے دیا۔ آگے بڑھے تو، مزاج شناس رسول ﷺ کی نگہ بصیرت نے یہ فیصلہ کر دیا کہ ان احادیث میں سے ''سنت'' کون کون سی ہے۔ اس طرح ''دین'' کا تعین ہو گیا جسے اللہ تعالیٰ نے نوع انسان کے لئے قیامت تک نظامِ حیات قرار دیا تھا۔ مولانا محمد اسماعیل مرحوم نے مودودی مرحوم کے اس مسلک کے متعلق فرمایا تھا۔

اگر ایک جماعت اپنی عقیدت مندی سے کسی ایک بزرگ یا قائد کو خدا کا مزاج شناس سمجھ لے یا رسول ﷺ کا مزاج شناس تصور کر کے پھر اسے اختیار دے دے کہ اصول محدثین کے خلاف جس حدیث کو چاہے قبول کر لے جسے چاہے رد کر دے یا کوئی عالم یا قائد بلا وجہ کسی موضوع یا متعلق، مرسل یا منقطع حدیث کے متعلق یہ دعویٰ کر دے کہ میں نے اس میں ''ہیرے کی جوت'' دیکھ لی ہے۔ تو یہ مضحکہ انگیز پوزیشن ہمیں یقیناً ناگوار ہے۔ ہم انشاء اللہ آخری حد تک اس کی مزاحمت کریں گے اور سنت رسول ﷺ کو ان ہوائی حملوں سے بچانے کی کوشش کریں گے۔

(جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث، ص:63)

اب آیئے ''کتاب وسنت'' کی اس اصطلاح کی طرف جسے ان حضرات نے اسلامی قوانین کی تدوین کے لئے آئین پاکستان میں شامل کرایا تھا۔ ہم نے اسی زمانہ میں کہہ دیا تھا کہ اس معیار کی رو سے قیامت تک بھی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکے گا جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں اس لئے کہ ''سنت'' ہر فرقہ کی الگ ہے جس میں وہ کسی قسم کے ردوبدل کو جائز قرار نہیں دیتے۔ ان حضرات کے پاس، اس اعتراض کا جواب، کفر کے فتویٰ کے سوا کیا ہو سکتا تھا! بیس برس تک یہ لوگ اپنے اسی ''جہاد'' میں مصروف رہے لیکن اس کے بعد مودودی مرحوم کو مجبوراً یہ اعلان کرنا پڑا کہ:

کتاب وسنت کی رو سے پبلک لاز کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو شیعہ، اہل حدیث اور حنفیوں کے نزدیک

متفقہ طور پر اسلامی قرار پاسکے۔

(ایشیاء، مورخہ 23 اگست 1970ء)

دلچسپ بات یہ ہے کہ مودودی مرحوم نے اِدھر یہ اعلان کیا اور اُدھر اپنی جماعت کے انتخابی منشور میں یہ شق بھی شامل کر دی کہ:

جماعت اسلامی کے پیش نظر پاکستان کو ایک ایسی ریاست بنانا ہے جو قرآن وسنت کے اتباع کی پابند ہو۔

بہر حال، جب مودودی مرحوم نے کہا کہ: ''کتاب وسنت'' کی رو سے پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں ہوسکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی قرار پاسکے تو ان سے پوچھا گیا کہ پھر پاکستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ کی کیا شکل ہوگی؟ فرمایا کہ یہاں فقہ حنفی نافذ کر دی جائے! یعنی ''کتاب وسنت'' کو تو اس لئے متروک قرار دے دیا کہ تمام فرقے اس پر متفق نہیں ہوسکیں گے اور اس کا علاج یہ بتایا کہ یہاں ایک فرقہ (حنفی) کی فقہ نافذ کر دی جائے گویا اس پر سب فرقے متفق ہو جائیں گے!! دوسرے فرقے تو ایک طرف، فقہ کے متعلق خود مودودی مرحوم کے عقائد یہ ہیں کہ:

1۔ اس مسخ شدہ مذہبیت میں بنیادی نقص یہ ہے کہ اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔

(ترجمان القرآن بابت محرم 1360ھ)

2۔ مجتہد خواہ کتنا ہی باکمال کیوں نہ ہو، زمان ومکان کے تعینات سے بالکل آزاد نہیں ہوسکتا نہ اس کی نظر تمام ازمنہ واحوال پر وسیع ہوسکتی ہے لہٰذا اس کے تمام اجتہادات کا تمام زمانوں اور تمام حالات کے مطابق ہونا غیر ممکن ہے۔

(تفہیمات، حصہ دوم، ص:426)

3۔ انسان خواہ سراسر اپنی رائے سے اجتہاد کرے یا کسی الہامی کتاب سے اکتساب کر کے اجتہاد کرے، دونوں صورتوں میں اس کا اجتہاد دنیا کے لئے دائمی قانون اور اٹل قاعدہ نہیں بن سکتا کیونکہ انسانی تعقل اور علم ہمیشہ زمانہ کی قیود سے مقید ہوتا ہے۔ (تنقیحات، ص:120)

اس کے برعکس تمام زمانی ومکانی قیود سے آزاد اگر کوئی ہے تو وہ صرف خداوند عالم ہے جس کے پاس علمِ حقیقی ہے، اور جس کے علم میں زمانہ کے تغیرات سے ذرا برابر کوئی تغیرّ واقع نہیں ہوتا۔

(تنقیحات، ص:120)

فقہ:

اس مقام پر مختصر الفاظ میں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ فقہ کسے کہتے ہیں اور یہ کیسے وجود میں آئی یہ بتایا جاچکا ہے کہ عہدِ

عباسیہ میں، احادیث کو اس لئے جمع اور مرتب کیا گیا کہ ان کے ذریعے اللہ اور رسول کی اطاعت کا فریضہ ادا کیا جا سکے لیکن اس زمانے تک زندگی کے تقاضے اس قدر بڑھ چکے تھے کہ احادیث کی رو سے تمام مسائل کا حل مل نہیں سکتا تھا اور اگر ملتا بھی تھا تو احادیث کے عین مطابق عمل کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ اس دشواری کے پیش نظر بعض مقنّنین نے سوچا کہ اسلام کو بہ ہیئت مجموعی سامنے رکھ کر، اپنے غور و تدبر (تفقہ) کی رو سے ان مسائل کا حل مستنبط کیا جائے ان کے اس طرح وضع کردہ قوانین کو فقہ کہا جاتا ہے اور فقہی احکام کی پیروی کو ''خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت'' قرار دے دیا جاتا ہے۔ جب استنباط مسائل کی یہ طرح پڑی تو فقہی قوانین کے بکثرت مجموعے مرتب ہو گئے ان میں سے چار نے زیادہ شہرت حاصل کی تھی یعنی:

نمبر شمار	نام	پیدائش	وفات
1۔	امام اعظمؒ ابوحنیفہ (کوفی)	80ھ	150ھ
2۔	امام مالکؒ (یمنی)	93ھ	179ھ
3۔	امام شافعیؒ (عسقلانی مکی)	150ھ	204ھ
4۔	امام احمد بن حنبل (بغدادی)	164ھ	241ھ

یہ سنی حضرات کے ائمہ فقہ ہیں شیعہ حضرات کی فقہ جعفری الگ ہے۔ سنیوں میں اہل حدیث کا الگ فرقہ ہے جو کسی فقہ کے قائل نہیں وہ براہ راست حدیث پر عمل کرنے کے قائل ہیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ احادیث، جامعین حدیث کے قیاس کی رو سے منتخب ہوئیں اور فقہ، فقہاء کے قیاس کا نتیجہ ہے۔ لیکن ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ''اَطِیْعُوا اللہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' کا ذریعہ یہی احادیث یا فقہ ہیں۔ معتقدین حدیث کا عقیدہ ہے کہ حدیث قرآن کی مثل ہے (مثلہ معہ) بلکہ یہ قرآن کو منسوخ بھی کر سکتی ہے اس طرح فقہ حنفیہ کے ایک مسلمہ امام، ابوالحسنؒ عبید اللہ کرخی کا قول ہے کہ:

> ہر وہ حدیث جو اس طریقہ کے خلاف ہو جس پر ہمارے اصحاب (ائمہ فقہ) ہیں، یا تو مسئول ہے یا منسوخ اسی طرح جو حدیث اس قسم کی ہو، وہ مؤل ہے یا منسوخ۔

(تاریخ التشریع الاسلامی مؤلفہ علامہ محمد الخضری، اردو ترجمہ شائع کردہ دارالمصنفین، اعظم گڑھ 421)

ان حضرات کے نزدیک، دین، فقہ میں تکمیل تک پہنچ چکا ہے۔ اب فقہ میں مزید تحقیق و تفتیش یا اجتہاد کی ضرورت ہے نہ ان احکام میں کسی قسم کا ردوبدل ہو سکتا ہے۔ قرآن کریم نے یہ خصوصیت کلمات اللہ (احکام و قوانین خداوندی) کی بتائی تھی کہ ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ انسانوں کے وضع کردہ ان احکام (فقہی قوانین) کو ابد تک غیر متبدل قرار دے کر، انہیں قوانین خداوندی کا ہم پایہ بنا دیا یہ ہمارا قیاس نہیں ان حضرات کا عقیدہ ہے کہ فقہی احکام قرآن کی مثل ہیں۔ فقہ حنفی میں الھدایہ معتبر ترین کتاب ہے۔

اس کی جلد اوّل کے مقدمہ میں کہا گیا ہے کہ ''الھدایہ کالقرآن ۔'' (الھدایہ قرآن کی مثل ہے)

(بحوالہ ہفت روزہ ''اہلِ حدیث''، مورخہ 12 فروری 1982ء)

ان تصریحات کی روشنی میں آپ اس نکتہ پر غور کیجئے جو ہمارا بنیادی موضوع گفتگو ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں (شیعہ فرقہ کو چھوڑ کر) سنیوں کے ہاں احادیث کے چھ مجموعے ہیں جنہیں صحاح ستہ کہا جاتا ہے ان میں جو روایات آ گئی ہیں وہ غیر متبدل ہیں۔ اس کے بعد فقہ کے (کم از کم) چار آئمہ کی طرف منسوب قوانین ایسے ہیں جو غیر متبدل سمجھے جاتے ہیں۔ کیا یہ کسی طرح بھی ممکن ہے کہ ان کے متبعین اپنے اختلافات چھوڑ کر، اُمت واحدہ بن جائیں!

مکاتب فکر:

(ضمناً) ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآنِ کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے اور اختلاف کو خدا نے غضب کا موجب۔ جب ان آیات قرآنی کو بہ تکرار و اصرار سامنے لایا گیا جن میں فرقہ بندی کو شرک قرار دیا گیا ہے تو یہ حضرات بڑی مشکل میں پھنس گئے ان کے پاس اس اعتراض کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس سے ذرا سی اُمید بندھتی تھی کہ شاید یہ حضرات اپنی روش پر نظر ثانی کرنے کے لئے مجبور ہو جائیں اور سوچیں کہ اس شرک کو توحید سے کس طرح بدلا جا سکتا ہے۔ لیکن (معلوم نہیں وہ کون تھا جس نے ان کے کان میں یہ افسوں پھونکا کہ) یہ فرقے ہیں ہی نہیں یہ مکاتب فکر ہیں اس خود فریبی یا ابلہ فریبی سے یہ حضرات بہت خوش ہو گئے کہ اب ہم فرقوں کے پابند رہتے ہوئے بھی مشرک قرار نہیں پائیں گے یعنی رام داس کا نام عبدالرحمٰن رکھ دینے سے سمجھ لیا کہ وہ کافر نہیں رہا مسلمان ہو گیا ہے!

ذرا مکاتب فکر اور فرقوں کے فرق پر غور فرمایئے ہمارے ہاں بڑے بڑے مشہور مفکر (فلاسفر) گذرے ہیں (مثلاً) بوعلی سینا، فارابی، رازی، الکندی وغیرہ ـــ ان میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا ''مکتبہ فکر'' (School of Thought) تھا۔ کیا آپ نے کبھی سنا ہے کہ بوعلی سینا کے مکتبہ فکر کے پیرو اپنی نماز الگ پڑھتے تھے اور فارابی کا مکتبہ فکر الگ نماز! کیا آج مسلمانوں کے ممالک میں کہیں کوئی گروہ ایسا ہے جو بوعلی سینا کے طریق پر نماز ادا کرتا ہو، یا فارابی کے طریق پر!ـــ ان کے برعکس ذرا فرقوں پر نگاہ ڈالئے بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ـــ صلوا کما رایتمونی اصلی

(کتاب الاذان)

نمازوں کا اختلاف:

''یعنی تم اس طرح نماز پڑھو جس طرح تم مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو'' ـــ اگر یہ روایت نہ بھی ہوتی تو بھی بات واضح تھی کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے صحابہؓ کے ساتھ ساری عمر نمازیں ادا فرمائیں انہوں نے نہ صرف یہ کہ حضور ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھا بلکہ خود بھی اسی طرح نماز پڑھتے رہے۔ اس کے بعد آج تک نہ تو اُمت میں ذرا سا بھی انقطاع (GAP) واقعہ ہوا یعنی

یہ حادثہ ایک لمحہ کے لئے بھی رونما نہیں ہوا کہ دنیا میں کہیں بھی مسلمان نہ رہے ہوں۔ نہ ہی کبھی نماز کا فریضہ ترک کیا گیا بالفاظ دیگر لاکھوں مسلمانوں نے حضور ﷺ کے ساتھ، حضور ﷺ جیسی نماز ادا کی اور اس کے بعد اس عمل محسوس کا تسلسل آج تک جاری ہے۔ اس سے عام سمجھ بوجھ کا انسان بھی اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ یہ عمل محسوس آج بھی بعینہ ویسا ہونا چاہئے جیسا رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تھا لیکن امر واقعہ کیا ہے؟ یہ کہ مسلمانوں میں متعدد فرقے ہیں اور ہر فرقے کی نماز الگ الگ ہے اور طرفہ تماشا یہ کہ ہر فرقہ کا دعویٰ ہے کہ جو نماز وہ ادا کرتے ہیں وہ بعینہ وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ ادا فرماتے تھے! کیا عقل سلیم اسے باور کرتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی نماز رسول اللہ ﷺ کی نماز کے مطابق ہے؟ یہ فرقے کس طرح ثابت کرتے ہیں کہ ان کی نماز ''جزئیات'' تک رسول اللہ ﷺ کی نماز کے مطابق ہے؟ احادیث کی رو سے فقہ کی رو سے مختلف حدیثیں اور فقہی احکام ہر فرقہ کی نماز کی تائید میں سند بہم پہنچا دیتے ہیں۔ اس کے بعد ان میں بحث اس امر پر چل پڑتی ہے کہ تمہاری حدیث ضعیف ہے اور ہماری صحیح۔

کہہ دیا جاتا ہے کہ (شیعہ حضرات کی نماز سے قطع نظر) سنیوں کے مختلف فرقوں کی نماز میں جو اختلاف ہے وہ فرعی سا ہے اصولی طور پر سب کے ہاں نماز مشترک ہے اور ان فروعی اختلافات کو چنداں اہمیت حاصل نہیں سو اول تو یہی غلط ہے کہ ان فروعی اختلافات کو چنداں اہمیت حاصل نہیں۔ ان فرقوں کے نزدیک انہیں اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ ایک فرقے کے پیروکار کسی دوسرے فرقے والوں کے ساتھ مل کر نماز پڑھنا تو کجا اگر (مثلاً) نیچی آواز سے آمین کہنے والا اونچی آواز سے آمین کہنے والوں کی مسجد میں نماز پڑھ لے تو وہ، اگر اپنی مسجد کا فرش اکھیڑ نہیں دیں گے تو کم از کم، اسے دس بار دھو کر پاک اور صاف ضرور کریں گے یہ جو آئے دن ''وہابیوں اور بدعتیوں'' یا ''بریلویوں اور دیوبندیوں'' کی مسجدوں میں تنازعے اٹھتے ہیں ــــ امام قتل کر دئے جاتے ہیں ــــ مقتدیوں میں دنگا فساد ہوتا ہے ــــ پولیس مداخلت کرتی ہے ــــ مسجد پر تالہ پڑ جاتا ہے اور مقدمہ عدالت میں پہنچ جاتا ہے ــــ تو یہ نماز کے فروعی اختلاف کی وجہ ہی سے ہوتا ہے۔ لہٰذا، یہ کہنا کہ ان فروعی اختلافات کو چنداں اہمیت حاصل نہیں، حقیقت کا بطلان اور محض اعتراض سے بچنے کے لئے فرار کی راہ اختیار کرنے کے مرادف ہے۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ جب کسی حکم کو خدا (یا اس کے رسول، کا متعین فرمودہ قرار دیا جائے تو اس کے اصول اور فروع سب اپنی اپنی اہمیت رکھتے ہیں اور ان میں سے کسی میں بھی اختلافات نہیں کیا جاسکتا مثلاً قرآنِ کریم نے وضو کے سلسلے میں کہا ہے۔ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ (5:6) اپنے منہ دھویا کرو اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں تک۔ اب اگر کوئی شخص اپنے ہاتھ پہنچوں تک دھوئے، اور دوسرا کہنیوں تک، تو کیا آپ کہہ دیں گے کہ یہ بھی ٹھیک ہے اور وہ بھی ٹھیک کیونکہ یہ فرق محض فرعی ہے اصولی نہیں؟ ایسا کہنا صریحاً غلط ہوگا ان میں سے ٹھیک ایک ہی ہوسکتا ہے اور وہی ٹھیک ہوسکتا ہے جس کا عمل قرآن کے حکم کے مطابق ہو لہٰذا، نماز کی جو جزئیات رسول اللہ ﷺ نے متعین فرمائی تھیں، جب تک ان کی بعینہٖ پابندی نہیں کی جائے گی، نماز رسول اللہ ﷺ کی نماز کے مطابق قرار نہیں پائے گی یہ کہنا کہ کسی نے ہاتھ کانوں تک اٹھا لئے یا نیچے

رکھے ہاتھ سینے تک باندھ لئے یا زیر ناف آمین بالجہر کر لی یا خفی پاؤں میں اتنا فاصلہ رکھ لیا یا اتنا امام کے پیچھے سورۃ الفاتحہ پڑھی یا نہ پڑھی، یا فلاں دعا یوں پڑھ لی یا یوں۔ تراویح آٹھ پڑھ لیں یا بیس، عید کی نماز میں تکبیریں اتنی کہہ لیں یا اتنی نماز فلاں وقت پڑھ لی یا فلاں وقت اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ یہ جزئیات کا فرق ہے محض اعتراض سے بچنے کا بہانہ ہے۔ اگر اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا تو (مثلاً) کسی اہل حدیث سے کہیئے کہ وہ حنفیوں کی سی نماز پڑھ کر اعلان کر دے کہ اس کی نماز ہو گئی ہے؟ وہ ایسا کبھی نہیں کرے گا۔

آپ نے یہ اعتراض عام طور پر سنا ہوگا کہ اگر ہم احادیث کو نہ مانیں تو بتایئے کہ نماز کس طرح پڑھی جائے گی! اس کا اولین جواب تو تصریحات بالا میں موجود ہے کہ احادیث کی رو سے کونسی نماز کو رسول اللہ ﷺ کی نماز کہا جائے گا؟

اس سلسلہ میں ایک اور اہم سوال سامنے آتا ہے۔ قرآنِ کریم میں اقیموا الصلوٰۃ آیا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ یہ حکم مجمل ہے اور اس اجمال کی تفصیل احادیث میں ملتی ہے۔ اس تفصیل کے مطابق نماز ادا کرنے سے خدا کے حکم کی تعمیل ہو سکتی ہے۔ اس کے بغیر نہیں۔

قرآنِ کریم میں یہ بھی حکم آیا ہے کہ اعدلوا (5:6) یعنی عدل کرو یہ حکم بھی اسی طرح مجمل ہے جس طرح اقیموا الصلوٰۃ کا حکم کیا اعدلوا کے اجمالی حکم کی تعمیل کے لئے احادیث رسول اللہ ﷺ میں دی گئی تفاصیل کی ضرورت نہیں؟ یعنی ان تفاصیل کی کہ عدل کی مشینری کس قسم کی ہوگی، اس کا طریق کار (Procedure) کیا ہوگا؟ نماز کی تفاصیل اور جزئیات کے متعلق تو انبار در انبار کتابیں تصنیف کی گئی ہیں اور تصنیف کی جا رہی ہیں۔ کیا عدل کی مشینری اس کی جزئیات، اس کے طریق کار کی تفاصیل بھی احادیث کی رو سے اس طرح مرتب کی گئی ہیں؟ اگر نہیں کی گئیں تو کیوں؟ یہ واضح ہے کہ نبی اکرم ﷺ مسجد نبوی ﷺ میں عدل کا فریضہ ادا فرماتے تھے! اطاعت سنت کی رو سے تو آج بھی مساجد ہی میں عدالتیں قائم ہونی چاہئیں۔ کیا علماء کرام میں سے کسی نے آج تک یہ فتویٰ دیا ہے کہ ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ کی عمارات میں بیٹھ کر عدل کرنا خلاف سنت رسول اللہ ﷺ لہٰذا ناجائز ہے؟ اگر ایسا نہیں کیا گیا (اور ظاہر ہے نہیں کیا گیا) تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صلوٰۃ کی جزئیات اور نظام عدل کی جزئیات میں یہ فرق کیوں کیا جا رہا ہے؟ یا مثلاً قرآن میں ہے کتب علیکم الصیام (2:182) ''تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں۔'' روزوں کے جزئیاتی احکام بھی احادیث کی رو سے مرتب کئے جاتے ہیں اور ان کی پابندی ضروری۔ ان میں سے کسی ایک جزئیہ کی خلاف ورزی سے بھی روزہ نہیں ہوتا!

اس کے ساتھ ہی قرآنِ کریم میں یہ بھی آیا ہے کہ: کتب علیکم القتال (2:217) ''تم پر جنگ فرض قرار دیا گیا ہے۔'' کیا قتال (جنگ) کی بھی روزوں جیسی جزئیات مرتب کی گئی ہیں؟

حضور ﷺ کے زمانے میں جنگ تیروں اور تلواروں کے ذریعے لڑی جاتی تھی۔ کیا آج بھی اس سنت رسول اللہ ﷺ کے اتباع میں) جنگ تیروں اور تلواروں سے لڑی جائے گی، اور بندوقوں اور توپوں کے ذریعے جنگ لڑنا خلاف سنت۔ لہٰذا، ناجائز قرار پا جائے گا؟

سوچئے کہ نماز اور روزہ سے متعلق احکام میں سنت رسول اللہ ﷺ کی مطابقت کے بارے میں اس قدر شدت اور عدل اور قتال کے احکام کے سلسلہ میں سنت رسول اللہ ﷺ سے ایسی بے اعتنائی! ایسا کیوں ہے؟ اس کا جواب واضح ہے کہ یہ احکام اس زمانے میں مدون ہوئے تھے جب مذہب اور حکومت میں ثنویت پیدا ہو چکی تھی جس کی رو سے نماز، روزہ مذہب کے دائرے میں آئے تھے اور عدل اور قتال حکومت کے حیطہ اقتدار میں لہٰذا اتباع سنت کی تاکید اور شدت اعتقادات اور عبادات کے باب میں برتی گئی اور نظامِ حکومت کو مملکت کے حوالے کر دیا گیا۔

اسلامی مملکت میں ایسا نہیں ہوگا، اس میں قرآن کے تمام مجمل احکام کی تفصیلات، مملکت متعین کرے گی۔

◇□◇

بات یہاں سے چلی تھی کہ اور تو اور نماز جیسے بنیادی فریضہ میں بھی اس قدر اختلافات صدیوں سے چلے آرہے ہیں اور ان کی بنیاد احادیث اور فقہ پر ہے۔ اس کے بعد سوچئے کہ کیا آج کوئی ذریعہ ایسا ہے جس سے حتمی اور یقینی طور پر متعین کیا جاسکے کہ رسول اللہ ﷺ کس طریق کی نماز ادا فرمایا کرتے تھے؟ اسی ایک مثال پر دیگر احکام کو قیاس کر لیجئے! اور پھر آپ خود ہی فیصلہ فرما لیجئے کہ ان احکام کی ادائیگی سے کیا یہ تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ ہم ''اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول'' کا فریضہ ادا کر رہے ہیں!

یہ تمام خلفشار اور انتشار یہ سب اختلاف وافتراق یہ ساری بے یقینی اور ناپختگی یہ سب اس لئے ہے کہ صدرِ اوّل کے بعد، ملوکیت آ گئی اور ''**اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول**'' کا قرآنی مفہوم امت کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا، اور اس کا مفہوم ہم نے اپنے ذہن سے متعین کر لیا۔ **اطیعوا اللہ** کے متعلق کہہ لیا کہ اس سے مراد کتاب اللہ کی اطاعت ہے۔ اور **اطیعوا الرسول** کا ذریعہ وہ احادیث جنہیں رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر دیا گیا اور ان پر مبنی فقہی احکام۔ جب تک دین کی اس اساس اور بنیاد کا صحیح مفہوم سامنے نہیں آتا اور اس پر عمل نہیں کیا جاتا، نہ امت میں وحدت پیدا ہوسکتی ہے، نہ دین کا تمکن، اور اسلام کا احیاء ہوسکتا ہے آیئے ہم دیکھیں کہ اس کا قرآنی مفہوم کیا ہے۔

◇□◇

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ کا قرآنی مفہوم

مختصر الفاظ میں یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اس سے مفہوم کیا ہے۔ اب ہم اس اجمال کی تفصیل کی طرف آتے ہیں۔ سب سے پہلے اس بنیادی حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ ''اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول'' سے دو الگ الگ اطاعتیں مقصود نہیں۔ (یعنی اللہ کی اطاعت الگ اور رسول کی اطاعت الگ) دین میں اطاعت صرف خدا کی مطلوب ہے۔ رسول اللہ ﷺ خدا کی اطاعت کرتے تھے اور خدا ہی کی اطاعت کراتے تھے۔ حضور کا عظیم ترین مقام ومنصب عبدہ (خدا کا محکوم واطاعت گزار) ہے۔ اس کا علان ہم ساری دنیا کے سامنے یہ کہہ کر کرتے ہیں کہ:

اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمداً عبدہ ورسولہ

اسلام، مذہب نہیں جس میں ہر شخص انفرادی طور پر، خدا کی پرستش، بندگی، پوجا پاٹ، (Worship) کرے تو اطاعت کا فریضہ ادا ہو جاتا ہے۔ یہ دین ہے یعنی نظامِ حیات جس میں خدا کی اطاعت صرف اپنی آزاد مملکت میں ہوسکتی ہے۔ یہ مملکت (یا اس کی حکومت) دنیا میں منفرد تھی۔ یعنی اس میں محکومیت کسی انسان کی نہیں ہوتی تھی۔ صرف خدا کی ہوتی تھی اور خدا نے اس مقصد کے لئے اپنی کتاب نازل کی تھی۔ لہٰذا اس میں اطاعت صرف کتاب اللہ کی تھی۔

لیکن انسانی دنیا میں کتاب اللہ کی حکومت بھی نظام کے تحت ممکن تھی۔ یہ نظام نبی اکرم ﷺ نے قائم فرمایا تھا جس کے اولین سربراہ بھی حضور ﷺ خود تھے۔

اس انداز حکومت اور اطاعت کے لئے قرآنِ کریم نے ایک منفرد اصطلاح مقرر کی یعنی ''اطیعو اللہ و اطیعو الرسول'' اس سے مراد یہ تھی کہ خدا کی اطاعت لیکن انفرادی طور پر نہیں اس نظام کی رو سے جسے رسول اللہ ﷺ نے قائم فرمایا تھا اور رسول کی بھی اپنی اطاعت نہیں بلکہ رسول ﷺ کی وساطت سے خدا کی اطاعت۔ ایک آئینی نظامِ حکومت میں، حکومت کے ادنیٰ سے عامل کے حکم کی اطاعت اس کی اطاعت نہیں ہوتی اس حاکم اعلیٰ کی اطاعت ہوتی ہے جس کا وہ کارپرداز ہوتا ہے۔ جب چوراہے پر کھڑا سپاہی آپ سے کہتا ہے کہ بائیں طرف چلئے، تو وہ آپ سے اپنا حکم نہیں منواتا حاکم اعلیٰ کا حکم منواتا ہے۔ قرآنی حکومت میں بھی صورت ایسی ہی ہوتی ہے۔ جب وہ کہتا مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہَ ۚ (4:80) تو اس کا مطلب یہی ہے کہ تم جو رسول کے حکم کی اطاعت کرتے ہو تو یہ رسول کی اطاعت نہیں یہ خدا کی اطاعت ہوتی ہے کیونکہ رسول احکام خداوندی کی اطاعت کراتا ہے۔ اپنی نہیں اس کا منصبی فریضہ ہی خدا کی اطاعت کرانا ہے۔ اطاعت کے اسی انداز کو وہ ''اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول'' کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے قرآنِ کریم میں اس کے بکثرت شواہد موجود ہیں۔ ان میں سے چند ایک یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

1۔ سورۃ المائدہ کی مشہور آیت ہے:

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْىٌ فِى الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۳۳﴾ (5:33)

اس آیت کا عام ترجمہ یہ ہے:

بلا شبہ ان لوگوں کی، جو ''اللہ اور اس کے رسول (ﷺ)'' کے ساتھ جنگ کرتے ہیں، اور ملک میں فساد پھیلانے کے لئے دوڑتے پھرتے ہیں، یہ سزا ہے کہ انہیں قتل کر دیا جائے یا سولی چڑھا دیا جائے یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمت سے کاٹ دیئے جائیں یا انہیں جلاوطن کر دیا جائے یہ ان کے لئے اس دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بھی ان کے لئے عذاب عظیم ہے۔

اس میں ''اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے خلاف جنگ'' کے الفاظ آئے ہیں۔ متقدمین سے لے کر متاخرین تک، سب کے نزدیک اس سے مراد اسلامی حکومت کے خلاف جنگ کرنے کے ہیں۔ اس آیت کی تفسیر میں امام محی السنۃ بغوی نے معالم التنزیل میں، اور نواب صدیق حسن خان (مرحوم) نے فتح البیان میں لکھا ہے۔

حضرت ابن عباس سعید بن مسیب، مجاہد، عطاء، حسن بصریؒ، ابراہیم نخعی، ضحاک اور ابوثور نے کہا کہ جس نے اسلامی محروسہ (ریاست) میں ہتھیار اٹھایا اور راستوں کو پر خطر کر دیا پھر وہ گرفت میں آیا اور پکڑا گیا اس کے بارے میں مسلمانوں کے امام (سربراہ مملکت) کو اختیار ہے کہ جو چاہے سزا دے۔

امام رازیؒ نے اس آیت کی تفسیر میں امام ابوحنیفہؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

''اگر باغی یا ڈاکو نے قتل بھی کیا ہے اور مال بھی لیا ہے، تو امام کو اختیار ہے کہ تینوں سزاؤں میں سے جو سزا اس کو چاہے دے۔''

ہمارے زمانے میں، سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) اپنی تفسیر، تفہیم القرآن میں اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(فساد فی الارض میں) زمین سے مراد وہ ملک یا علاقہ ہے جس میں امن و انتظام قائم کرنے کی ذمہ داری اسلامی مملکت نے لے رکھی ہو اور ''خدا اور رسول'' سے لڑنے کا مطلب اس نظام صالح کے خلاف جنگ کرنا ہے جو اسلامی حکومت نے ملک میں قائم رکھا ہو___ ایسا نظام جب کسی سرزمین میں قائم ہو جائے تو اس کو خراب کرنے کی سعی کرنا،___ خدا اور رسول کے خلاف جنگ ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے تعزیرات ہند میں ہر شخص کو جو ہندوستان کی برطانوی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کرے۔ ''بادشاہ کے خلاف لڑائی'' (Waging War -- Against the King) کا مجرم قرار دیا گیا ہے چاہے اس کی کارروائی ملک کے کسی اور دور دراز گوشے میں ایک معمولی سپاہی کے خلاف ہی کیوں نہ ہو اور بادشاہ کی دست رس سے کتنا ہی

دور کیوں نہ ہو۔

(تفہیم القرآن، جلد اوّل ص:465، ایڈیشن 1951ء)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ اس آیت میں ''خدا اور رسول'' سے مراد اسلامی نظامِ حکومت ہے۔(یہ تقسیم ہند سے پہلے کی تحریر نظر آتی ہے۔)

اس مقام پر ایک اور نکتہ کی وضاحت بھی ضروری ہے ہم نے اوپر کہا ہے کہ آئینی حکومت میں صورت یہ ہوتی ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ عامل حکومت جب کوئی حکم دیتا ہے تو اس حکم کی اطاعت اس عامل کی اطاعت نہیں ہوتی، اس حکومت کی اطاعت ہوتی ہے جس کا وہ نمائندہ ہے۔ یہ وجہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے رسول ﷺ کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا ہے۔ دوسری طرف حکومت کی بھی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اس کے احکام کی اطاعت کرانے میں افسر مجاز جو کچھ کرتا ہے، حکومت اس کا اعلان کرتی ہے کہ وہ اس نے نہیں کیا، خود حکومت نے کیا ہے۔ حکومت اس کی پوری پوری ذمہ داری لیتی ہے۔ قرآنِ کریم نے اس حقیقت کی بھی وضاحت کردی ہے۔(مثلاً) جنگِ بدر میں، نبی اکرم ﷺ اور جماعت مجاہدین، مخالفین کو تہ تیغ کرتے ہیں اور خدا کا ارشاد ہوتا ہے کہ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ (8:17) ''تم نے انہیں قتل نہیں کیا تھا، ہم نے قتل کیا تھا۔'' اور نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے کہا جاتا ہے کہ: وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (8:17) ''میدانِ جنگ میں تم تیر نہیں چلا رہے تھے، ہم چلا رہے تھے۔'' ان کے ہر اقدام کی ذمہ داری خدا خود اپنے اوپر لیتا تھا۔ یا (مثلاً) صلح حدیبیہ کے موقعہ پر ایک اور نازک وقت آ گیا کہ جماعت مومنین نے، خدا کے ہاتھ اپنی جان و مال بیچ دینے کا جو معاہدہ کر رکھا تھا (9:111) اس کی تجدید کی ضرورت پڑ گئی تھی قاعدہ کے مطابق، صحابہؓ آتے تھے۔ تجدید معاہدہ (بیعت) کے لئے اپنا ہاتھ بڑھاتے تھے اور حضور ﷺ اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھ اس بیعت کی توثیق فرما دیتے تھے اس موقعہ پر ارشادِ خداوندی ہوا کہ: اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ۭ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ (48:10) ''اے رسول (ﷺ)! تمہارے جو رفقاء تجدید معاہدہ کے لئے جو تمہاری بیعت کرتے تھے، وہ تمہاری بیعت نہیں درحقیقت ہماری بیعت تھی۔ ان کے ہاتھ کے اوپر تمہارا ہاتھ نہیں تھا۔ اللہ کا ہاتھ تھا۔'' آئینی حکومت میں ہوتا ہی یہی ہے۔ حکومت کے ساتھ جتنے معاہدات ہوتے ہیں، افسران مجاز ان پر دستخط کرتے ہیں اور حکومت ان کی ذمہ داری لیتی ہے کہ وہ معاہدہ خود حکومت کے ساتھ ہوا ہے مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (4:80) کا مفہوم یہی ہے۔ حتیٰ کہ وہ حکومت اس کا بھی اعلان کرتی ہے کہ اس معاہدہ کی پابندی موجودہ حکومت پر ہی لازم نہیں اس حکومت کے بعد بھی جو حکومت آئینی طور پر قائم ہوگی (اس حکومت کی جانشین ہوگی) اس پر بھی اس کی پابندی لازمی ہوگی۔

یہ تھا مفہوم حضور ﷺ کے اس ارشاد کا کہ تم پر میرے طریق کی پیروی اور میرے خلفاء (جانشینوں) کے طریق کی پیروی ضروری ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو ذمہ داریاں انسانوں کے

سلسلہ میں اپنے اوپر لے رکھی ہیں، انہیں وہ اس نظام کے ذریعے پوری کراتا ہے۔ براہ راست خود آ کر پورا نہیں کرتا۔(اس موضوع پر میں اس سے پہلے بڑی تفصیل سے لکھ چکا ہوں)۔

1۔اب پھر اصل موضوع کی طرف آیئے ہم کہہ رہے تھے کہ ''اللہ اور رسول کے خلاف جنگ'' سے مراد نظامِ حکومت خداوندی کے خلاف جنگ تھی۔ اس سلسلہ میں سورۃ المائدہ کی آیت (5:33) ہمارے سامنے آ چکی ہے۔ دیگر حوالہ جات درج ذیل ہیں۔

2۔''خدا اور رسول ﷺ کے خلاف جنگ'' کے متعلق مسجد ضرار کے سلسلہ میں ہے کہ وہ مسجد پناہ گاہ تھی ان لوگوں کے لئے لِمَنۡ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ (9:107) جنہوں نے خدا اور رسول کے خلاف جنگ کی تھی نیز (9:63) اسی طرح سورۃ البقرہ میں ہے کہ اگر تم لوگ بقایا ربو، چھوڑ و گے تو فَاۡذَنُوۡا بِحَرۡبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ ۚ (2:279) تو اسے ''اللہ اور رسول ﷺ'' کی طرف سے اعلان جنگ سمجھو۔

3۔سورۃ الانفال کی پہلی آیت ہے قُلِ الۡاَنۡفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوۡلِ ۚ (8:1) ''انفال اللہ اور رسول ﷺ کے لئے ہے۔'' (انفال کے معنی عام طور پر مالِ غنیمت کئے جاتے ہیں۔) یہاں کہا ہے کہ انفال، اللہ اور رسول ﷺ کے لئے ہیں۔

امام ابن جریر طبریؒ اس آیت کی تفسیر میں مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> انفال کے معنی کے متعلق ان تمام اقوال میں سے قرین صواب ان لوگوں کا قول ہے جنہوں نے کہا ہے کہ یہ وہ اضافے ہیں جو امام وقت بعض یا کل فوج کے لئے کرتا ہے۔

اس سے واضح ہے کہ ان حضرات کے نزدیک ''اللہ اور رسول ﷺ'' سے مراد امام وقت (یعنی اس وقت کی حکومت کا سربراہ) ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) اس آیت کے تحت اپنے تشریحی نوٹ میں لکھتے ہیں کہ:

> مالِ غنیمت جو لڑائی میں ہاتھ آئے وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا ہے۔ یعنی یہ بات نہیں ہونی چاہئے کہ جو جس کے ہاتھ پڑ گیا وہ اسی کا ہو گیا بلکہ سب کچھ امام کے سامنے پیش کرنا چاہئے وہ اسے جماعت میں تقسیم کرے گا۔
>
> (ترجمان القرآن، جلد دوم، ص:53)

اسی طرح مالِ غنیمت کے خمس کے متعلق ہے کہ وہ ''اللہ اور رسول ﷺ''___ کے لئے ہے۔

4۔سورۃ الحشر میں ان یہودیوں کے متعلق جنہوں نے اسلامی مملکت کے خلاف سرکشی اختیار کی تھی، فرمایا کہ: ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ ۚ (59:4) ''جو لوگ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو اذیت پہنچاتے ہیں___'' اگر یہاں اللہ سے مراد ''اللہ تعالیٰ'' لئے جائیں تو بات بن ہی نہیں سکتی (اس لئے کہ خدا کو) اذیت کون پہنچا سکتا ہے اس سے مراد اسلامی نظام کے لئے اذیت اور پریشانی کا موجب بننا ہے۔

5۔اب آگے بڑھئے فتح مکہ کے بعد اسلامی مملکت نے فیصلہ کیا کہ مشرکین کو کعبہ میں آنے سے روک دیا جائے اس کے

لئے 9ھ حج اکبر کے اجتماع میں اعلان کیا گیا جس کے الفاظ یہ تھے:

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ (9:1)۔۔۔وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ (9:3)

جن مشرکین کے ساتھ تم نے صلح کا معاہدہ کیا تھا (لیکن انہوں نے اس معاہدہ کی خلاف ورزی کی) ان کے لئے اس حج اکبر کے اجتماع میں، اعلان کر دو کہ خدا اور رسول ﷺ نے اس معاہدے کو کالعدم قرار دے دیا اور اس کے بعد وہ اس باب میں بری الذمہ ہیں۔

ظاہر ہے کہ معاہدات کئے بھی حکومت کی طرف سے جاتے ہیں اور انہیں کالعدم بھی حکومت ہی کی طرف سے قرار دیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں ''اللہ اور رسول ﷺ'' کا مفہوم بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

6۔ قرآنِ کریم میں ایسی آیات بھی آئی ہیں جن میں ''اللہ اور رسول ﷺ'' کے الفاظ آتے ہیں لیکن ان کے لئے صیغہ واحد کا استعمال ہوا ہے۔ حالانکہ عربی زبان کے قاعدے کی رو سے، ان کے لئے تثنیہ کا صیغہ آنا چاہئے تھا۔ اس سے بھی واضح ہے کہ ''اللہ اور رسول ﷺ'' سے دو الگ الگ اطاعتیں مراد نہیں بلکہ ایک ہی مراد ہے۔ یعنی نظامِ حکومت کی اطاعت (مثلاً)

ا۔ سورہ انفال میں ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ (8:20)

اے جماعت مومنین! تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور اس سے (عنہ ___ واحد کا صیغہ ہے) روگردانی نہ کرو درآنحالیکہ تم اس حکم کو سن رہے ہو (اس کی تشریح ذرا آگے چل کر کی جائے گی۔)

ب۔ اسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (8:24)

اے جماعت مومنین! تم ''اللہ اور رسول ﷺ'' کی دعوت پر لبیک کہو جبکہ وہ (صیغہ واحد) تمہیں اس امر کی طرف بلا رہا ہے جو تمہیں زندگی عطا کر دے گا۔ (نیز 3:171)

ج۔ سورۃ النور میں ہے:

وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ (49-24:48)

اور جب (ان منافقین کو) اللہ اور رسول ﷺ کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ (صیغہ واحد) ان کے متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ کرے تو ان میں سے ایک فریق پہلوتہی کر لیتا ہے اور اگر ان کا کوئی حق کسی پر واجب ہو تو

پھر یہ اس کی طرف (صیغہ واحد) سر جھکائے ہوئے چلے آتے ہیں۔

د۔ اسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر ہے:

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ۭ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ۭ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (24:54)

اے رسول ﷺ! ان سے کہہ دو کہ وہ اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کریں ازاں بعد اگر یہ اس اطاعت سے روگردانی کرنے لگ جائیں تو یہ سمجھ رکھیں کہ اس پر (صیغہ واحد) صرف اس کی اپنی ذمہ داری ہے اور وہ تبلیغ احکامِ خداوندی ہے اور ان پر ان کی ذمہ داری اگر انہوں نے اس کی (صیغہ واحد) اطاعت کر لی تو صحیح راستے پر لگ جائیں گے۔

ان آیات میں دیکھئے! ''اللہ اور رسول ﷺ'' کے الفاظ آئے ہیں لیکن صیغے اور ضمائر واحد کے استعمال کئے گئے ہیں۔ یہ اس حقیقت کی بین دلیل ہے کہ اس اصطلاح سے مفہوم ــــ اسلامی نظامِ حکومت ہے۔

7۔ آیت (8:20) میں کہا گیا ہے ''اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ'' ''تم اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول ﷺ کی ــــ اور اس سے روگردانی نہ کرو جبکہ تم سن رہے ہو۔''

سمع وطاعت:

وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ (تم سن رہے ہو) اس میں ایک عظیم حقیقت پوشیدہ ہے۔ کتاب تو صامت (خاموش) الفاظ کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اس کی آواز سنائی نہیں دیتی اس کے لئے ایک زندہ اتھارٹی کی ضرورت ہوتی ہے جس کا حکم سنا جائے قرآنِ کریم میں اطاعت کے لئے سماعت (سننے) کی شرط متعدد مقامات میں آئی ہے۔ سورۃ البقرہ میں ہے وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (2:285) مومنین کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کہتے ہیں ــــ ''ہم نے اس حکم کو سن لیا ہے اور ہم اس کی اطاعت کریں گے۔ سورۃ المائدہ میں ہے اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (5:7) جب تم نے کہا تھا کہ ہم نے سن لیا ہے اور ہم اس کی اطاعت کریں گے۔ سورہ توبہ میں ہے کہ مومنین کا شیوہ ہے کہ: (24:51) ''جب انہیں اللہ اور رسول ﷺ کی طرف بلایا جاتا ہے کہ وہ (صیغہ واحد) ان کے اختلافی معاملات کا فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سن لیا ہے اور ہم اس کی اطاعت کریں گے۔

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے۔ دین میں خالی کتاب کی اطاعت ممکن نہیں اس کے لئے زندہ اتھارٹی کا ہونا ضروری ہے۔ جو حسب موقعہ اور ضرورت، کتاب کے احکام کا آرڈر دے اور جماعت اس آرڈر کی تعمیل کرے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے جو نظام قائم کیا تھا اس میں حضور ﷺ خود وہ پہلی زندہ اتھارٹی تھے جن کے آرڈرز کو سنا جاتا تھا اور ان کی اطاعت کی جاتی تھی یہی وہ نظام تھا جسے حضور ﷺ کے بعد بھی بدستور آگے چلنا تھا۔ جب تک وہ نظام قائم رہا، کتاب اللہ کی اطاعت، ایک زندہ اتھارٹی کی وساطت سے ہوتی رہی جب وہ نظام درہم برہم ہو گیا تو (قرآنی حکومت کے آرڈر دینے والی) زندہ اتھارٹی

باقی نہ رہی۔ دین مذہب میں تبدیل ہوگیا اور اطاعت کے لئے مجرد کتابوں کو کافی سمجھ لیا گیا اس کا نتیجہ وہ اختلاف وافتراق ہے جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ زندہ اتھارٹی وہ مرکز ہوتی ہے جس کے ساتھ وابستگی سے اُمت کی وحدت قائم رہتی ہے وہ نہ رہے تو وحدت اُمت کی کوئی صورت ہو نہیں سکتی۔ آخر میں ہم ایک ایسی آیت سامنے لاتے ہیں جس کے بعد یہ سمجھنے اور سمجھانے کے لئے کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں رہتی کہ قرآن کی رو سے،''اللہ اور رسول ﷺ'' سے مراد، قرآنی نظامِ حکومت ہے۔ یہ نظام ابتداًء مدینہ میں قائم ہوا تھا۔ مسلمان دیگر مقامات (بالخصوص مکہ) میں بھی تھے۔ انہیں حکم دیا گیا تھا۔ (بلکہ اسے ایمان کی شرط قرار دیا گیا تھا کہ وہ ہجرت کر کے مدینہ آجائیں دیکھئے اس کے لئے الفاظ کونسے استعمال کئے گئے تھے۔ فرمایا:

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ۭ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَي اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِـيْمًا ؁ (4:100)

جو شخص خدا کی راہ میں ہجرت کرے گا اسے دوسرے مقام میں بہت سی پناہ گاہیں، اور کشائش کی راہیں مل جائیں گی جو شخص، اللہ اور رسول ﷺ، کی طرف جانے کے ارادے سے گھر سے نکلے، اگر وہ اپنی منزل مقصود تک نہ بھی پہنچ پائے اور اسے راستے ہی میں موت آجائے تو خدا کے ہاں سے اسے بھی پورا پورا اجر مل جائے گا۔ نظامِ خداوندی میں حفاظت اور رحمت کے پورے پورے سامان موجود ہوتے ہیں۔

غور فرمایئے یہاں حکم تھا اسلامی نظام کی طرف ہجرت کرنے کا اور اس کے لئے''اللہ اور رسول ﷺ'' کی طرف جانے کے الفاظ آئے ہیں اگر خالی، رسول ﷺ، کا لفظ ہوتا تو پھر بھی کہا جا سکتا تھا کہ اس سے مراد وہ مقام (مدینہ) ہے جہاں حضور ﷺ اقامت پذیر ہیں۔ لیکن یہاں رسول ﷺ کے ساتھ، اللہ کا لفظ بھی آیا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی خاص مقام میں اقامت پذیر نہیں ہوتا کہ اس مقام کی طرف جانے کو ہجرت قرار دیا جائے۔ لامحالہ، اللہ اور رسول ﷺ، سے مراد ہی اس مقام کی طرف ہجرت ہے جہاں اسلامی نظام قائم ہوگیا تھا۔

اس ضمن میں ایک نکتہ اور بھی قابلِ غور ہے۔ مکہ کے مسلمانوں کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کا یہ حکم اس زمانے میں ملا تھا جب نظامِ خداوندی مدینہ میں قائم ہوا تھا اور مکہ میں غیر خداوندی نظام رائج تھا۔ بعد میں جبکہ مکہ فتح ہوا اور وہاں بھی قرآنی نظام رائج ہوگیا تو پھر وہاں کے مسلمانوں کو''اللہ اور رسول ﷺ'' کی طرف ہجرت کرنے کے لئے نہیں کہا گیا یہ اس لئے کہ اس کے بعد''اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت'' مکہ میں بھی ہو سکتی تھی۔ اس طرح جب قرآنی مملکت دور دراز کے علاقوں میں بھی پھیل گئی اور وہاں بھی اسلامی نظام قائم ہوگیا تو نہ صرف یہ کہ وہاں کے مسلمانوں سے نہیں کہا گیا کہ وہ''اللہ اور رسول ﷺ'' کی طرف ہجرت کریں، بلکہ خود مدینہ کے مسلمان ان علاقوں میں جا جا کر بس گئے یہ اس لئے کہ اب وہاں بھی''اللہ اور رسول ﷺ''(نظامِ حکومت خداوندی) موجود تھا۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی رو سے''اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول'' کا مفہوم کیا ہے اسلام کے صدرِ اوّل

(عہدِ رسالت وخلافتِ راشدہ) میں اس کا یہی مفہوم لیا جاتا تھا۔ بعد میں جب خلافت، ملوکیت میں بدل گئی تو نظامِ حکومت خداوندی بھی باقی نہ رہا، اور اس کے ساتھ ہی قرآنِ کریم کی مختلف اصطلاحات کا مفہوم بھی بدل گیا۔ ''اطیعواللہ واطیعوالرسول'' میں اللہ کی اطاعت الگ اور رسول کی ﷺ اطاعت الگ تصور کر لی گئی اور رسول ﷺ کی اطاعت کے لئے روایات کے مجموعے مرتب کرنے کی ضرورت لاحق ہوگئی۔ اگر اُمت کی قسمت یاوری کرتی تو سوچا جاتا کہ وہ کونسی کڑی گم ہوگئی ہے جس کی وجہ سے دین کا سارا نقشہ بدل گیا ہے لیکن ایسا نہ ہوسکا اور اُمت دین کی جگہ مذہب پر مطمئن ہو کر بیٹھ گئی اس کے بعد آج تک یہی کیفیت چلی آرہی ہے۔ اگر غلط کانٹا مڑنے سے گاڑی دوسری پٹڑی پر جا پڑے تو ابتداً (غلط اور صحیح پٹڑیوں میں) چند انچوں کا فرق ہوتا ہے لیکن جوں جوں گاڑی آگے بڑھتی جائے، وہ منزل سے دور تر ہوتی جاتی ہے اور جس قدر تیز رفتار سے وہ چلے، منزل سے اس کا بعد اسی نسبت سے زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ اس ہزار برس میں، اُمت کی گاڑی کے ساتھ یہی ہوا ہے۔ جتنی کوششیں ''اسلام'' کے فروغ کے لئے کی جاتی ہیں، ان سے مذہب کی گرہیں اور مضبوط ہوتی چلی جاتی ہیں اور چونکہ مذہب پیشہ (Profession) بن چکا ہے اس لئے اس سے وابستہ مفاد پرستیاں ان گرہوں کو اور بھی زور سے کستی رہتی ہیں۔

اندریں حالات، دین کا احیاء ان سعادت مند افراد کے ذریعے ہی ممکن ہوگا جو دین کے قرآنی تصور کو اچھی طرح سمجھ کر، اسے عملی پیکر میں متشکل کرنے کی جرأت اپنے اندر رکھتے ہوں لیکن اس کے لئے دین کے تصور کا سمجھ لینا ہی کافی نہیں ہوگا اس کے ساتھ، اپنی سیرت وکردار کو حضور نبی اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کے قالب میں ڈھالنا بھی ضروری ہوگا۔ یہ شرط جذباتی نہیں، خود خدا کی عائد کردہ ہے۔ لَقَدۡ كَانَ لَكُمۡ فِىۡ رَسُوۡلِ اللّٰهِ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ (33:21) ''یہ حقیقت ہے کہ رسول ﷺ کی زندگی تمہارے لئے بہترین (بلکہ حسین ترین) ماڈل ہے۔'' (اگرچہ یہ آیت (جنگ احزاب کے موقعہ پر) ایک خاص واقعہ سے متعلق ہے جہاں حضور ﷺ نے بے حد نازک مقام پر انتہائی شجاعت اور استقامت کا ثبوت دیا تھا، لیکن میرے نزدیک اس کا اطلاق حضور ﷺ کی پوری کی پوری سیرت پر ہوتا ہے۔ حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ جس بلندی کردار اور پاکیزگی سیرت کی مظہر تھی، وہ اُمت (ہی نہیں تمام عام انسانیت) کے لئے اسوۂ حسنہ ہے۔ اس کی پیروی اتباع سنت رسول اللہ ﷺ کہلائے گی۔) اس ماڈل کے بنیادی خط وخال بھی اللہ تعالیٰ نے خود قرآن کے اندر محفوظ کردیئے ہیں۔ میں نے حضور ﷺ کی سیرت طیبہ قرآنی آئینہ کے مطابق مرتب کی ہے (جو معراجِ انسانیت کے نام سے، قریب پانچ سوصفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔) اس میں سیرتِ نبوی ﷺ کے بنیادی عنوانات قرآن سے لے کر احادیث اور تاریخ سے وہ واقعات لئے گئے ہیں جو اس قرآنی عنوان کی تائید کرتے ہیں۔ اس سیرتِ طیبہ کو بطورِ ماڈل سامنے رکھنے سے مومن کے اندر وہ صفات منعکس ہونے لگ جاتی ہیں۔ یہ ہے مراد اسوۂ حسنہ کی پیروی سے۔

اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ احکام کی اطاعت اور اسوہ کی پیروی میں بنیادی فرق ہے۔ احکام کی اطاعت تو اسی نظام کی رو سے ہوگی جس کی تشریح سابقہ صفحات میں کی گئی ہے۔ اسوہ رسول اللہ ﷺ کے معنی ہوں گے اپنے اندر ان صفات کا پیدا کرنا جن کی حسین وجمیل مظہر حضور رسالتمآب ﷺ کی ذات اقدس تھی۔ ان صفات کے حاملین کی جماعت ہی اس قابل

ہوگی کہ وہ نظامِ خداوندی کو از سرِ نو قائم کر سکے۔ خدا کے وعدہ کے مطابق، قائم تو اسے بہر حال ہونا ہے۔ دیکھیں یہ سعادت کس خطہ زمین اور کن طالع مند افراد کے حصے میں آتی ہے۔ یہ اسی سرزمین میں قائم ہو سکے گی جس میں مذہبی پیشوائیت کا عمل دخل نہ ہو۔ اس نظامِ خداوندی کی اطاعت بمنزلہ ''اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت'' کے ہوگی۔

اس نظام میں اطاعت، قرآنِ کریم کے قوانین واصول واقدار کی ہوگی ان قوانین کے نفاذ کے طور طریق اور ان اصول واقدار کی جزئیات، اُمت کے مشورہ سے، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق متعین کی جائیں گی۔ ایسا کرنے میں، روایات اور فقہ میں جو کچھ قرآن کے خلاف نہیں ہوگا اس سے بطور نظائر مدد لی جائے گی۔ ان کی حیثیت غیر متبدل، ابدی قوانین کی نہیں ہوگی اللہ تعالیٰ نے لا تبدیل، (غیر متبدل) صرف کلمات اللہ کو قرار دیا ہے۔ خود خلافت راشدہ کے زمانے میں، حضور ﷺ کے عہد کے کئی ایک احکام میں تبدیلیاں بھی کی گئیں اور نئے احکام کا اضافہ بھی۔ (تفصیل اس کی میری کتاب ''شاہکارِ رسالت'' میں ملے گی۔) ایسا ہی ہر نظامِ خداوندی میں ہوگا جو امور (قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے) اُمت کے باہمی مشورہ سے طے ہوں گے، ان میں کسی بعد کی حکومت میں تو ایک طرف، خود اسی حکومت کے دوران، بہ تقاضائے حالات، ردوبدل اور حک واضافہ کا امکان ہوگا۔ اس طرح جو قوانین واحکام، قرآنی حکومت کی طرف سے نافذ ہوں گی اسلامی یا شرعی قوانین کہلائیں گے۔ حکومت کے سوا کسی کو اس کا حق حاصل نہیں ہوگا کہ کسی بات کو اسلامی یا غیر اسلامی قرار دے دے۔

ماحصل:

1۔ اطاعت صرف خدا کی جائز ہے اور کسی کی نہیں۔

2۔ خدا کی اطاعت کا عملی طریق اس کی کتاب کی اطاعت ہے۔

3۔ یہ اطاعت اپنے طور پر نہیں ہوگی اسلامی حکومت کے ذریعے ہو سکے گی۔

4۔ اسلامی حکومت وہ ہے جو قرآنی طریق سے وجود میں آئے اور اس کا اعلان کرے کہ اس کا فریضہ قرآنی احکام، قوانین، اقدار اور اصولوں کا نافذ کرنا ہے۔ یہ کچھ اُمت کے مشورہ سے ہوگا۔

5۔ اسلامی حکومت میں نہ کوئی کسی کا محتاج ہوگا نہ محکوم۔ تمام افراد معاشرہ کے رزق کی ذمہ داری مملکت کے سر ہوگی اور اطاعت صرف کتاب اللہ کی ہوگی۔

6۔ اس میں پیدائش کے اعتبار سے انسان اور انسان میں کوئی تمیز نہیں ہوگی سب افراد یکساں واجب التکریم ہوں گے اور حقوق وفرائض کے اعتبار سے عورتوں اور مردوں میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔

7۔ اس میں نہ نظامِ سرمایہ داری باقی رہے گا نہ تھیاکریسی (مذہبی پیشوائیت)۔

8۔ یہ ان افراد کے ہاتھوں وجود میں آئے گی جن کی سیرت، اسوہ نبی اکرم ﷺ کے قالب میں ڈھلی ہوگی۔ اس سے یہ سرزمین خدا کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔

خورشید انور، سوات

قرآن اور ہمارا سفر

(کنونشن 2018ء کے موقع پر پڑھا گیا مقالہ)

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے
پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی مکیں آنی، ازل تیرا ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے
تیری فطرت امیں ہے ممکنات زندگانی کی
جہاں کے جوہر مضمر کا گویا امتحاں تو ہے

آج میرا موضوع سخن ہے۔ ''قرآن اور ہمارا سفر'' مطلب یہ کہ طلوع اسلام کا ماضی کس حد تک مطالب قرآنی کے مطابق رہا ہے، حال میں ہم کہاں کھڑے ہیں اور مستقبل کے لئے قرآن ہم سے کیا مطالبہ کرتا ہے اور ہماری حکمت عملی کیا ہونا چاہئے۔ موضوع بہت وسیع ہے مگر میں اختصار کی ہر ممکن کوشش کرونگا۔

میرے عزیز بھائیو اور بہنو:

طلوع اسلام کے قیام کا مقصد اقبال کے خوابوں کے مطابق مستقبل کی ایک اسلامی ریاست کے لئے فکری اساس مہیا کرنا تھا۔ ایک ایسی ریاست جس نے بقول اقبالؒ ''عربی ملوکیت کے اثرات سے آزاد ہو کر'' دنیا کے سامنے اسلام کا عملی نمونہ پیش کرنا تھا۔ پہلا چیلنج اس ریاست کا قیام تھا اور دوسرا چیلنج اس ریاست کو مقصد کے حصول کی طرف گامزن کرنا تھا۔ پہلا چیلنج بہت مشکل تھا جس میں چاروں طرف ایک صبر آزما لڑائی لڑنی تھی۔ ایک طرف غاصب انگریز حکمرانوں کی شاطرانہ چالیں تھی، دوسری طرف تنگ نظر ہندوؤں کا تعصب تھا، تیسری طرف مسلمان عوام کی سادہ لوحی اور خواب غفلت تو چوتھی طرف نیشنلسٹ علماء تھے۔ پہلے تین محاذوں پر تو قائد اعظم محمد علی جناح تن تنہا کافی تھے لیکن چوتھا محاذ سب سے پر خطر اس وجہ سے تھا کہ یہ محاذ منبر رسولؐ کے قابضین کا تھا۔ ان کی ہر بات کو مذہب کی سند حاصل تھی ، اور اگر قائداعظم ان کے ساتھ نظری مباحث میں الجھ جاتے تو تحریک پاکستان پر بہت برے اثرات مرتب ہوتے۔ یہی محاذ تھا جس کو علامہ اقبال نے خود اور ان کی وفات کے بعد طلوع اسلام اور علامہ پرویز صاحب نے سنبھالا۔ کانگرس کے ہمنوا علماء کا نظریہ یہ تھا کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے منبر سے اٹھنے والی اس آواز کی مخالفت کرنا کسی ایرے غیرے کا کام کہاں تھا۔ مرد درویش علامہ اقبالؒ نے اس فتنے کو برسر عام چیلنج کرتے ہوئے اعلان فرمایا:

عجم ہنوز نداند رموز دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بولعجبی است
سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است
بہ مصطفی برساں خویش را کہ دین ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

اقبالؒ کی وفات کے بعد علامہ پرویزؒ نے اس علم کو تھام لیا اور طلوع اسلام کے پلیٹ فارم سے اس محاذ کو اس خوش اسلوبی سے سنبھالا کہ قائداعظم کو عملی جدوجہد کے لئے دیگر محاذوں پر لڑنے کی فرصت ملی اور تقریباً ایک عشرے کی قلیل مدت میں بظاہر ناممکن نظر آنے والے معرکے کو سر کر لیا اور پاکستان دنیا کے نقشے پر ایک نظریاتی اساس لیکر ابھرا۔

عزیز ساتھیو: قیام پاکستان کے بعد یعنی 1947ء سے لیکر 1985ء میں اپنی وفات تک تقریباً 38 سال پرویز صاحب نے اپنی زندگی اور طلوع اسلام کا پلیٹ فارم قرآن سے دور ملوکیت کی گرد ہٹانے کیلئے وقف کی۔ وہ گرد جس کی وجہ سے اسلام کا اصل چہرہ دنیا کی دیگر اقوام تو کیا خود مسلمانوں کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ پرویز صاحب نے نہ صرف قرآنی لٹریچر کا بیش بہا خزانہ مرتب کیا بلکہ دروس قرآن اور تقاریر کی شکل میں طالبان قرآنی کی تشنگی کافی حد تک دور کر دی۔ اسکے ساتھ ساتھ انہوں نے بزمہائے طلوع اسلام کی شکل میں ملک بھر میں اور بیرون ملک ایک وسیع حلقہ احباب پیدا کیا۔ پرویز صاحب نے غیر قرآنی اور پاکستان مخالف اٹھنے والے ہر فتنے اور آواز کے خلاف اپنے قلم اور زبان کے ذریعے مسلسل جہاد کیا۔ ایک انسان کے بس میں جو تھا اس نے یقیناً اپنی بساط سے بڑھ کر کیا۔ پرویز صاحب نے جو کچھ کیا اسے ایک قرآنی نظام مملکت کیلئے بلاشبہ کافی مسالہ کہا جا سکتا ہے۔ اس سفر میں کئی صاحبان اقتدار بھی پرویز صاحب کے ہمنوا ہوئے لیکن شائد مفاد پرستی یا مصلحت کوشی کے بناء پر وہ نہ تو کھل کر سامنے آئے اور نہ ہی منزل کے جانب قدم آگے بڑھانے میں کوئی مدد دی۔

دوستو یہ تھا طلوع اسلام کا شاندار اور قابل رشک ماضی جو پرویز صاحب اور ان کے چند رفقاء کی شبانہ روز کاوشوں کا مرہون منت ہے۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں تدبیریں نہ تقدیریں
جو ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

عزیز ساتھیو: اب ذرا اپنے حال کی طرف آتے ہیں۔ حال کی ایک جھلک تو گذشتہ سال ادارہ کی طرف سے بزمہائے طلوع اسلام کو وہ مراسلہ ہے جس میں اس خدشے کا اظہار کیا گیا تھا کہ مالی مشکلات کی وجہ سے ماہنامہ طلوع اسلام بند ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس مجلہ کا جاری رہنا نہ صرف ہماری علامتی موجودگی کے لئے ضروری ہے بلکہ اس کو انٹرنیٹ کے ذریعے دنیا کے کونے کونے میں پہنچایا جاتا ہے۔ ماہنامے کی اشاعت کی افادیت اپنی جگہ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم اپنے حلقہ اثر میں جتنا اضافہ کرنے کے قابل ہیں اس سے کئی لاکھ گنا زیادہ مختلف فرقوں کے آلہ کار ہر سال مدرسوں سے فارغ ہو رہے ہیں۔ اور ان میں ہر فرد منبر کی وراثت کی سند لے کر معاشرے میں آتا ہے۔ اس صورت حال میں مقدار کے لحاظ سے تو ہماری برتری ناممکن ہے تاہم معیار کے لحاظ سے ہمیں سوچنا ہوگا۔ اگر ہم نے واقعی مملکت پاکستان کو ایک

فکری اساس مہیا کرنی ہے تو اس کیلئے گفتار کی بجائے کردار پر توجہ دینی ہوگی جو جماعت مومنین سے قرآن کریم کا ایک بنیادی مطالبہ ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (61:2)

مومنو تم ایسی باتیں نہ کہا کرو جو کرتے نہیں ہو۔

اس آیت کو دیکھتا ہوں تو گماں ہوتا ہے کہ ہمارا حال قرآن کریم کے احکام سے مطابقت نہیں رکھتا۔

کیونکہ اللہ تعالی کا یہ بھی ارشاد ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (41:30) جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر جم کر کھڑے رہے تو ان پر فرشتوں کا نزول ہوگا جو کہیں گے کہ خوف اور حزن نہ کرو اور خوش خبری سنو اس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ معاہدہ کر کے اس کے احکام کی تعمیل کیلئے جم کر کھڑے ہونے کی صورت میں غیر اللہ کا خوف اور کسی قسم کا حزن باقی نہیں رہتا اور حریت فکر کے نتیجے میں کائناتی قوتیں انسان کی رفیق بن جاتی ہیں جو ہر قدم پر اس کی معاون ہوتی ہیں لیکن اگر ہم نے اپنی تحریک کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تو پھر بقول اقبالؒ:

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

قرآن کریم کہتا ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (3:110)

تم بہترین امت ہو جسے انسانوں کے فائدے کیلئے میدان میں لایا گیا ہے کہ تم معروف کا حکم دو اور منکرات سے روکتے رہو۔

ظاہر ہے کہ اس فریضہ کا مقصد محض وعظ و نصیحت نہیں، بلکہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کیلئے قوت و اقتدار ارضی ناگزیر ہے۔ اگر کوئی گروہ یہ دعویٰ کریں کہ اقتدار کے معاملات سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں اور وہ مروجہ غیر قرآنی نظام مملکت میں مطمئن ہو کر زندگی بسر کریں تو ان کے متعلق قرآن کریم کی وعید ملاحظہ فرمائیں سورہ آل عمران میں ارشاد ہے۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (3:85)

یعنی جو کوئی اسلام کے علاوہ کسی اور نظام زندگی کو اختیار کریگا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔

عزیزان محترم: ہم تو روایتی مذہب کو بھی خیرباد کہہ چکے ہیں۔ کہ ثواب کی امید پر اپنے آپ کو مطمئن کر لیں یعنی قرآن کے رو سے ہماری پوزیشن یہ ہے کہ ہم نے لا الہ تو کہہ دیا لیکن الا اللہ کے راستے پر گامزن ہونے میں گومگو کا شکار ہیں۔ ہم سب اس بات کے قائل ہیں کہ اعمال کے صحیح اور غلط ہونے کی کسوٹی اس کے نتائج ہوتے ہیں جو ہمارے سامنے حقیقت ثابتہ بن کر کھڑے ہوتے ہیں۔ تو ہمیں یہ سوچنا چاہئے کہ بحیثیت جماعت یا تحریک نتائج کے اعتبار سے ہمارا آج کا عمل کس حد تک قرآن کے مطابق ہے۔ کیونکہ پاکستان بحیثیت ریاست اپنی حقیقی منزل سے دوری کے جانب بڑی تیزی سے گامزن ہے۔ اور اس کی فکری اساس کا امین طلوع اسلام بھی اپنی تاریخ کے بدترین بحران سے گزر

رہا ہے۔ اکثر دوستوں کی رائے ہے کہ ہم اپنی سرگرمیوں میں جوں کے توں مگن رہیں اور جب حالات خود بخود سازگار ہو جائینگے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اگر ہم حالات کے از خود بہتری کے انتظار میں اسی طرح بیٹھے رہے تو ہم شائد حالات کو قابو کرنے کے قابل تو نہ رہیں البتہ یہ ممکن ہیں کہ حالات ہمیں اپنے دھارے میں بہالے جائیں۔ اگر ہم نے عملی طور پر کچھ کرنا ہے تو سب سے پہلے بحیثیت جماعت ہمیں اپنی سوچ اور نفسیات میں تبدیلی پیدا کرنی ہوگی جو قرآن کریم کے رو سے خارجی انقلاب کے لئے بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ سورہ رعد آیات نمبر 11 میں ارشادِ ربانی ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (13:11) اللہ کسی بھی قوم کی (خارجی) حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ قوم اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا نہیں کرتی۔

دنیا کی تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ نفسیاتی تبدیلی کے بغیر دنیا میں کوئی انقلاب اپنے مقاصد کو حاصل نہیں کر سکا ہے۔

اور اسلام کی تاریخ بتاتی ہے کہ حضور ﷺ نے 63 سال کی عمر پائی۔ چالیس سال کی عمر میں آپ ﷺ کو نبوت ملی جس کے بعد 13 سال کی مکی زندگی اور 10 سال کی مدنی زندگی ہے۔ 13 سال کی مکی زندگی بظاہر مشکلات اور مصائب کی زندگی ہے جس میں حضور ﷺ اور صحابہ کرامؓ کو قدم قدم پر روکاٹوں کا سامنا تھا اور تحریک آگے بڑھتی نظر نہیں آرہی تھی۔ لیکن اسکے مقابلے میں مدنی زندگی کامیابیوں اور کامرانیوں سے عبارت ہے جب ایک اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آیا اور مسلمانوں نے بڑی تیزی سے ترقی کی منازل طے کیں۔ لیکن اگر بنظر تعمق دیکھا جائے تو مدنی زندگی کی کامیابیوں کا سہرا 13 سالہ مکی دور کے مشکلات و مصائب کے سر ہے جب ایک جماعت کے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا ہو رہی تھی۔ اس جماعت نے آگے جا کر مسلم ریاست کے عوام اور معاشرے میں خمیر کا کردار ادا کرنا تھا۔ نتیجتاً ایک ایسا بامقصد اور پائیدار انقلاب برپا ہوا جس کے خوشگوار نتائج سے پوری دنیا منور ہوئی۔ آج بھی وہی حالات ہیں وہی معاشرہ ہے وہی چیلنجز ہیں اور وہی ابدی پیغام ہے۔ بقول اقبالؒ

آگ ہے اولاد ابراہیم ہے نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

اور اقبال ہی کی زبان میں ۔

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

عزیزانِ محترم: اب سوال یہ ہے کہ کس طرح طلوع اسلام کو ایک فعال جماعت بنا کر اولاً اس ملک میں اور اسکے بعد پوری دنیا میں قرآنی انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے؟ میری رائے میں پہلا کام اراکین بزم ہائے طلوع اسلام کی تربیت اور دوسرا کام قرآنی پیغام کو عام کرنے کے لئے جدید ذرائع ابلاغ تک رسائی ہے۔ لیکن ان دونوں کاموں سے پہلے ایک عملی پروگرام ترتیب دینا ضروری ہے۔ کیونکہ ایک تبلیغی جماعت بن کر ہم انقلاب کا تصور نہیں کر سکتے جب تک ہمارے سامنے ایک بامقصد اور واضح پروگرام یعنی Road Map نہ ہو۔

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

آپ سب کا بہت بہت شکریہ!

آصف جلیل، کراچی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے، کرنے والے میں

عجیب سا عنوان ہے؟ میں نے بہت سوچا مگر اس سے مناسب کوئی اور لفظ ذہن میں نہ آیا۔ قرآن کریم سے جہاں زندگی کے تمام امور میں راہنمائی ملی وہاں غور وفکر کی اہمیت اجاگر ہوئی۔ قرآن کے بارے میں تدبر کرنے کا بھی کہا گیا ہے۔ نہایت افسوس کا مقام ہے کہ ان سب کو دانستہ یا نادانستہ نظر انداز کیا گیا ہے تاکہ ابلیسی نظام میں کوئی روکاوٹ نہ ڈال سکے اور اس کے تین بنیادی ستونوں کو کوئی نہ ہلا سکے۔ میری مراد فرعونیت، قارونیت اور ہامانیت سے ہے۔ میں برسوں سے ہاتھوں میں چلنے والی مالاؤں اور کبھی کبھی چین کے ایجاد کردہ گنتی کرنے والے ڈیجیٹل آلات دیکھ رہا ہوں۔ یہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے؟ بتایا یہ گیا ہے کہ کچھ الفاظ یا آیات منہ سے ادا کرنے سے نیکیاں یا ثواب ملتا ہے۔ لیکن گنتی کی کیا ضرورت ہے؟ اللہ تعالیٰ تو بے حساب دیتا ہے، یہ بے اعتباری کیوں؟ ہاں یہ غور طلب بات ہے جو مشکل ہے کہ وہ کون سے اعمال ہیں جن کا وزن ہی نہیں کیا جائے گا۔

عوام تو تقلید پسند ہیں جو ہوتے دیکھا اسی کو حق سمجھ لیا مگر حیرت تو ان لوگوں پر ہوتی ہے جنہیں عالم دین کہا جاتا ہے۔ ان میں سے کچھ تو عربی زبان جانتے ہوں گے۔ یا جو تعلیم یافتہ طبقہ ہے انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ منہ سے الفاظ دہرانے سے کیا حاصل ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل میں یہ سب کچھ کیا جاتا ہے۔ کیا اس نے بتایا ہے کہ ایسا کیوں کرنا ہے؟ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ یا ان کو سمجھنے میں غلطی لگی ہے؟ ان زبانوں میں جو میں جانتا ہوں فعل کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ اس میں کسی کام کو کرنے کا ذکر ہوتا ہے، مثال کے طور پر کھانا، پینا، چلنا، دوڑنا وغیرہ۔ اگر کوئی شخص بیٹھے ہوئے ورد کر رہا ہو کہ 'میں چل رہا ہوں، میں چل رہا ہوں' تو آپ حیرانی سے اسے دیکھ کر کہیں گے کہ جناب آپ چل نہیں رہے بلکہ تشریف فرما ہیں۔ لیکن عربی زبان کے ماہرین کو بھی حیرانی نہیں ہوتی جب ایک شخص اللہ تعالیٰ کی ہدایت پر عمل کرنے کی بجائے کچھ الفاظ دہرا رہا ہو۔ کیونکہ سوچنا چھوڑ رکھا ہے۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی واضح ہدایت کہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لِمَ تَقُوۡلُوۡنَ مَا لَا تَفۡعَلُوۡنَ (61:2) اے ایمان لانے والو وہ بات کہتے کیوں ہو جو کرتے نہیں؟ اس کے بعد مزید زور دے کر کہا کہ اللہ کے نزدیک یہ بات بڑی مذموم اور قابل گرفت ہے کہ تم ایسی بات کہو جو تم کرتے نہیں۔ یہ جرأت راوی ہی کر سکتے ہیں۔ محض زبان سے الفاظ دہرا کر ان گنت نیکیاں کمانے کا فن اس طرح کی روایات سے آیا ہے جن کے وضعی اور خلافِ قرآن ہونے میں ذرہ برابر شک نہیں ہے۔

ابوالاسود دیلی سے روایت ہے کہ سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ چند اصحاب رضی اللہ عنہم، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کی اے اللہ کے رسول! مال والے سب مال لوٹ لے گئے، اس لیے کہ وہ نماز پڑھتے ہیں جیسے ہم پڑھتے ہیں اور روزہ رکھتے ہیں جیسے ہم روزہ رکھتے ہیں اور صدقہ دیتے ہیں اپنے زائد مالوں سے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمہارے لیے بھی تو اللہ تعالیٰ نے صدقہ کا سامان کر دیا ہے کہ ہر تسبیح صدقہ ہے اور ہر تکبیر صدقہ ہے اور ہر تحمید صدقہ ہے اور ہر بار لا الہ الا اللہ کہنا صدقہ ہے۔ (مسلم)۔

اب دیکھتے ہیں کہ ان تینوں الفاظ کے معانی کیا ہیں۔ 'سبحوا' یہ فعل امر ہے جس کے معنٰی ہیں بھرپور کوشش کرو۔ اس پر عمل کرنے کی بجائے لوگ ہر نماز کے بعد 'سبحان اللہ' پڑھتے ہیں گویا عمل کرنے کی بجائے زبان سے الفاظ ادا کر دیئے۔ جہاں یہ لفظ آتا ہے وہاں یہ ترجمہ کیا جاتا ہے کہ تسبیح بیان کرو۔

کبروا اللہ بھی فعل امر ہے جس کے معنٰی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے قانون کو ہر شے سے بالا رکھو۔ اس کا قانون سپریم ہے۔ اس پر اللہ اکبر کا ورد رائج ہے۔ اس لئے جو نتیجہ نکلنا چاہئے تھا نہیں نکلتا۔ اور ترجمے میں آتا ہے کہ اللہ کی بڑائی بیان کرو۔

الحمد کا لفظ بھی قرآن کریم میں آیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ جو بھی کام اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق کیا جائے تو بے اختیار اللہ کی حمد نکلے گی۔ یعنی وہی عمل قابل ستائش ہیں جو اس کی ہدایت کے مطابق ہوں۔ اب بجائے اس کے کہ ایسے عمل کیے جائیں جن کا نتیجہ اللہ تعالی کی حمد کا مظہر ہوتا محض الحمد للہ کہنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اور ترجمے میں یہ آتا ہے کہ سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔

اکثر اس جملے کا ورد بھی بہت زیادہ کیا جاتا ہے۔ ''اَسْتَغْفِرُ اللهَ رَبِّیْ مِنْ کل ذَنْبٍ وَّ اَتُوْبُ اِلَیْہِ'' جس کا عام طور پر ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ سے ہر گناہ کی بخشش چاہتا ہوں اور اس سے توبہ کرتا ہوں۔ گویا کہنا ہی کافی ہے حالانکہ استغفار کرنے کا کام ہے۔ اگر قرآنی اقدار کے خلاف کوئی عمل سرزد ہو جائے تو اللہ تعالیٰ نے اس کا نتیجہ رونما ہونے تک کے لئے ایک مہلت کا وقفہ دیا ہوا ہے جو ہر عمل کے مطابق کم یا زیادہ ہو سکتا ہے۔ اس وقفہ کے دوران اگر اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق حفاظت کے لئے تدبیر کی جائے تو اس کے مضر اثرات سے بچا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے ''تاب واصلح'' کا ذکر آتا ہے۔ توبہ کو مثال سے اس طرح سمجھایا جا سکتا ہے کہ اگر سفر کرتے ہوئے غلط سمت میں چل نکلیں تو جونہی یہ احساس ہو کہ یہ راستہ منزل کی طرف نہیں جاتا تو اسی مقام سے واپس لوٹ کر اس جگہ جایا جائے جہاں سے سفر شروع کیا تھا۔ یہ عمل توبہ ہے اور اس کے بعد صحیح راستہ اختیار کرنا اصلح کہلائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا اسم مبارک اور اس کی صفات

قرآن کریم ہدایت کی کتاب ہے جسے پڑھنے کا مقصد یہ ہے کہ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے اسے سمجھا جائے اور پھر عمل کیا جائے۔ یہ ایک ایسا نظام تجویز کرتا ہے جو تمام انسانوں کے مسائل اور پریشانیاں دور کرے لیکن لوگوں کو یہ بتایا گیا ہے کہ اس کو پڑھنے سے ثواب ہوتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک ایک حرف پر نیکی ملتی ہے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی پڑھ نہیں سکتا تو محض الفاظ پر انگلی پھیرنے سے بھی ثواب ہوتا ہے۔ اس کے بعد کون اسے سمجھنے کی زحمت کرے گا۔ بعض سورتوں کو کسی خاص موقع پر پڑھنے کے الگ سے فوائد ہیں جو مختلف شکلوں میں آپ تک پہنچائے جاتے ہیں جن میں ایک سورہ یاسین مرنے کے عمل کو آسان بناتی ہے۔ چار قل پڑھنے کے فوائد حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ فریم میں لگا کر دیوار پر لٹکانے سے بھی اس کا اثر ہو جاتا ہے، بلائیں ٹل جاتی ہیں۔ کوئی مخصوص آیات یا سورتیں پڑھ کر پھونک مارنے سے جسمانی اور روحانی علاج کر رہا ہے۔ ہر شخص مطمئن ہے کہ کوئی بات نہیں اگر دنیا میں مشکلات ہیں، آخرت میں اس کے لئے جنت ہے تا کہ ان کی توجہ ان دشمنوں کی طرف نہ جا سکے جو زمین اور اس سے نکلنے والے خزانوں پر سانپ بن کر بیٹھے ہوئے ہیں اور عوام کو محروم کر رکھا ہے۔ اس لئے آسان نسخہ بتایا گیا کہ قرآن کریم کا ایک ایک لفظ پڑھنے پر نیکی ملتی ہے۔ ان جمع شدہ نیکیوں کی بنا پر غریبوں کو اخروی جنت عطا ہو گی، چاہے دنیاوی زندگی میں انہیں بے شمار مصائب کا سامنا ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ اس کے علاوہ یہ مردوں کی بخشش کا باعث بھی بنتی ہیں۔ نت نئے وظائف سامنے لائے جاتے ہیں جو کسی نہ کسی موقع پر پڑھے جاتے ہیں۔ صدیوں سے جاری پڑھنے کا یہ عمل اس قدر راسخ ہو چکا ہے کہ اب لوگ اس کے بارے میں کوئی دلیل سننے کو تیار نہیں ہیں۔ اس میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد بھی شامل ہیں۔ زندگی کے ہر شعبہ میں سنی سنائی روایات نے قرآن کریم کی جگہ لے لی ہے۔ اس سے ہدایت لینے کی بجائے اسے بلا سوچے سمجھے پڑھا جاتا ہے۔ رمضان میں تو تقریباً ہر مسلمان اس کا ختم کرتا ہے۔ محض پڑھنے سے ملنے والی نیکیوں نے مذہب پرستوں کو ایسی خوش فہمی میں مبتلا کر رکھا ہے کہ جتنے بھی غلط عمل کیے جاتے ہیں ان کے مقابلے میں ان نیکیوں کا پلڑا بھاری رہتا ہے اور یہ تسلی رہتی ہے کہ میں نے جنت میں ہی جانا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو معاشرے میں رائج جھوٹ، فریب، دھوکہ دہی، ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی، چوری، ڈاکے اور حتیٰ کہ قتل جیسے جرائم کرنے والے بالکل خوف زدہ نہیں ہوتے کہ ان کا انجام کیا ہو گا جب ذرے ذرے کا حساب لیا جائے گا۔ ایک غلط تصور کے بھیانک نتائج سے ہر شخص متاثر ہو رہا ہے۔ ہر وقت لاقانونیت اور جرائم عام ہونے کا نوحہ پڑھا جاتا ہے لیکن اس کا سبب تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ قرآن کریم ہدایت کی کتاب ہے اس کا زبانی ورد کرنے سے بہتر ہے کہ ہر روز چند آیات سوچ سمجھ کر پڑھ لی جائیں اور ان میں سے جن پر انفرادی طور عمل کرنا ممکن ہے وہ ضرور کئے جائیں۔ اور موجودہ ابلیسی نظام کی جگہ قرآن کے تجویز کردہ نظام کے لئے مسلسل کوشش کی جائے۔ اس کے لئے بزم ہائے طلوع اسلام کے زیر اہتمام ہونے والے درس قرآن سنے جائیں اور طلوع اسلام کی کتب کا مطالعہ کیا جائے۔ باقی جو کچھ ہو رہا ہے اس کی ناکامی میں کوئی شک نہیں ہے نہ اس سے حالات بدلنے کی کوئی امید نہیں ہے۔

شیخ محمد عقیل حیدر، فیصل آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عربی محاورے

مغرب کے ایک بڑے دانشور جولین ہکسلے نے انیس سو باون میں ٹائمز اخبار میں انٹرویو دیتے ہوئے چند جملے کہے تھے جو اس دور میں حضرتِ انسان کی ان سطحی مذاہب سے بیزاری ظاہر کر رہے تھے بلکہ بطور مفکر ایسے مذہب کی جستجو کا اظہار کر رہے تھے جو ان خود ساختہ مذاہب جیسا نہ ہو کہ جس سے انسان کا شعور ہی مطمئن نہ ہو سکے۔ اس نے کہا کہ وہ جس مذہب کی تلاش میں ہے اس کتاب کی زبان ایسی ہونی چاہیے کہ: ''جو ایک طرف ایسی سلیس (سادہ) ہو کہ عام سطح کے انسان بھی اس سے مستفید ہو سکیں اور دوسری طرف اس قدر عمیق اور پر معنی کہ ایک بلند پایہ مفکر بھی اس سے مطمئن ہو جائے۔''

اگر میں کہوں کہ قرآن کریم کی زبان اس معیار پر پوری اترتی ہے تو آپ یقیناً یہ سوال کریں گے کہ پھر جولین ہکسلے نے اس کتاب کو کیوں نہیں پڑھا۔ تو میں کہوں گا کہ میں نے بھی بہت سی کتابوں کو نہیں پڑھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے سامنے یہ کتاب آئی ہی نہ ہو یا پھر اس نے اس کتاب کی حامل قوم کی حالتِ زار کو دیکھتے ہوئے اس کتاب کو پڑھنے کے لائق ہی نہ سمجھا ہو مزید یہ کہ کیا ایسا تو نہیں کہ اس کتاب کے بارے میں ہمارا متذکرہ بالا دعویٰ درست بھی ہے کہ نہیں تو اس کے لیے ضروری تھا کہ ہم اس کتاب کو اسی طور دیکھیں اور پرکھیں مگر بد قسمتی ہے کہ اس کتاب کے بزعم خویش جو لوگ وارث بنے بیٹھے ہیں انہوں نے اس کتاب کو ایک مخصوص ذہن کے ساتھ پڑھنے کو لازمی قرار دے لیا اور جس کسی نے بھی ان کے مقرر کیے ہوئے مخصوص معیار سے ہٹ کر اس کتاب کو پڑھنے یا اس کی تشریح و توضیح کرنے کی کوشش کی اسے راندہ درگاہ قرار دیتے ہوئے نہ صرف دنیا میں اس کی زندگی کو اجیرن کر دیا بلکہ آخرت کے عذابوں کی بھی وعید سنا کر لوگوں سے دور کرنے کی ترکیب کر دی۔ مگر وقت کا ٹھہراؤ مشکل ہے، ارتقا کا سفر جاری ہے، خود خدا نے اپنی کتاب میں کہا ہے کہ آنے والے وقت میں انفس اور آفاق کی نشانیاں اس کی حقانیت کا اقرار انسانیت کی زبان سے کروالیں گی۔ وقت کا پہیہ گھوم کر اس مقام پر آ جاتا ہے کہ اس کتاب کا تنہا دعویٰ کرنے والا طبقہ وقت کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اٹیکنگ پوزیشن سے ڈیفنسو پوزیشن میں آ جاتا ہے اور اقبال کو کہنا پڑتا ہے۔

بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیران خرابات   مے خانہ نے کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل

یہ درست ہے کہ وقت کا یہ پہیہ بہت سی دہائیوں کو گزار گیا اور بہت سے انسان اس کتاب کے اصل مقام سے لاعلم ہی رخصت ہوئے تاہم آنے والا دور اسی کتاب کا ہے۔ کائنات کے قوانین عملی شکل میں حضرتِ انسان پر عیاں ہو رہے ہیں اور خالقِ کائنات کے قوانین اس کتاب میں موجود اپنے پردوں کی کشائی کے لیے حضرتِ انسان کے شعور کے ارتقا کے منتظر ہیں۔ اقبال کا شعر جو اس نے نطشے کے لیے کہا تھا اور کیا خوب کہا تھا بہ زبانِ حال یہاں صادق آتا ہے۔

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

یہاں پر دل چاہتا ہے کہ اگر جولین ہکسلے ہوتا تو میں اس کو قرآن کریم دیتا اور اس کتاب کے ایک ایک صفحہ کی تحریر انتہائی سادہ سلیس مگر جامع و گہری زبان کو دکھاتا اور سمجھاتا کہ یہ ہے وہ کتاب جس کی تجھے تلاش تھی ہاں یہ ہے وہ تحریر جو ایک عام ذہن کو اس کی شعوری سطح کے مطابق رہنمائی بھی دیتی ہے اور ''اولی الاباب'' کو ان کے شعور کی بلندی سے خطاب کرتی ہے۔ یہ انداز کیا ہے اور کیسے قائم رہتا ہے اس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم قرآن کریم کے اسلوب کو سامنے لائیں تھی۔ اس مفکر کا بیان کردہ معیار تھا کہ ایسی کتاب جو ایک طرف سلیس وسادہ ہو اور دوسری طرف عمیق و پرمعنی آپ تصور کیجیے کہ اس انسان کے لیے رہنمائی بھیجی جارہی ہے جو ہنوز ارتقائی منازل طے کرتا جارہا ہے یعنی ٹھہرے ہوئے شعور کے لیے ''رہنمائی'' نہیں بلکہ مسلسل ترقی پذیر شعور کے لیے ''رہنمائی'' تقابل کیجیے چودہ سو سال پہلے کا انسان اور آج کا انسان اسی ایک کتاب سے رہنمائی لے گا یہی نہیں تصور کیجیے کہ آج سے ایک ہزار سال بعد انسان کس مقام پر ہوگا؟ کیا وہ زمین کو چھوڑ کر خلاوں میں ڈیرے ڈال چکا ہوگا؟ یا اس نظامِ شمسی سے دور دوسرے سیاروں میں اپنی کالونیاں بسا چکا ہوگا؟ اور اس انسان کے شعور کی سطح کیا ہوگی؟۔ جی ہاں۔۔۔۔ اس (ایڈوانس) دور کے انسان نے بھی اسی قرآن کریم سے ہی رہنمائی لینی ہے جس قرآن سے آج سے چودہ سو سال پہلے کے انسان نے رہنمائی لی تھی۔ بات یہاں تک نہیں رکتی انسان کے ارتقاو ترقی کا سفر مسلسل جاری رہنا ہے۔ چلیے اگلی بات کرتے ہیں جب انسان وقت اور مادہ (یعنی ٹائم اینڈ سپیس) کو اپنے کنٹرول میں لے چکا ہوگا۔ جی ہاں مادہ کو اپنے کنٹرول میں کرنے کا مطلب اس موجود کائنات سے ماورا دوسری طرف کا سفر تو اس انسان کے شعور کی سطح کیا ہو گی؟ (یادرہے کہ میں انسان کے ارتقائی عروج پر گفتگو نہیں کر رہا محض ''حیات الدنیا والآخرہ'' کی رہنمائی کی بات ہورہی ہے) اس انسان کی رہنمائی بھی اسی کتاب نے ہی کرنی ہے جو اس کے خالق نے دی اور اسے کائنات کے آخری انسان تک کی ہدایت کے لیے کافی قرار دیا۔ دوستو جس کتاب نے چودہ سو سال پہلے کے انسان کے شعور کو مطمئن کرنا تھا اسی کتاب نے آج سے ہزاروں سال بعد کے خلائی دور کے انسان کے شعور کو بھی ڈائریکشن دینا ہے۔ اس کتاب کا اسلوب یقیناً اسی معیار کا ہوگا جو میعار جولین ہکسلے بیان کرتا ہے۔ بہت غور وفکر کے بعد مجھے یہ حقیقت سمجھ میں آئی کہ ربِ کائنات نے قرآن کریم کو اس انداز میں کیسے ڈھالا کہ وہ عام قاری کو سادہ فہم اور دانشوروں کو عمیق و پرمعنی ہو۔ ماہرِ لسانیات اس کے بہت سے لوازمات بتاتے ہوں گے مگر میں جس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ لوازمات جتنے بھی ہوں مگر ''محاورہ'' قرآن کریم کی تحریر کا ایک ایسا لازم جزو ہے جس کے بغیر درج بالا معیار مکمل نہیں ہوسکتا۔ اور اگر ہم قرآن کریم کی ''ٹرمنالوجی'' کو نظر انداز کردیں گے تو ہم اس ہدایت کو پہنچ ہی نہ سکیں گے جو قرآن کریم ہم تک پہنچانا چاہتا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کی ٹرمنالوجی (اور عربی محاورۃ العرب) کو سمجھنے کے لیے عربی محاوروں کی تشریح وتوضیح کا سلسلہ شروع کر رہے ہیں جو کہ وقفے وقفے کے ساتھ جاری رہے گا۔ میری کوشش ہوگی کہ قرآن کریم کی ٹرمنالوجی (محاورۃ العرب) کی تشریح وتوضیح میں جس قدر بھی ماہر لسانیات کے تحقیقی لٹریچر سے استفادہ ہوسکے کرنے کے بعد پیش کروں تاہم اس دوران کسی قسم کی کوتاہی کو نظر انداز کرنے کی بجائے نشاندہی میرے لیے زیادہ بہتر ثابت ہوگی۔

The Human Self and Allah

Episode No. 16

By G. A. Parwez
(Translated by: Dr. Ejaz Rasool)

7 *Razzaqiyat* (Provision of *Rizq*)

That means of sustenance which is received from some direction as a gift is called *Rizq*. But there is one distinction in its basic meaningand that is that it should be received at the timethat it is required. Hence, the meaning of *Rizq* is that means of sustenance which is receivedfreely from Allah according to the need of everythingwithout any effort or repayment. It should be made clear that 'getting *Rizq*' does not mean that ready baked bread is put into the mouth of man. By *Rizq*is meant that all the resources for the physical needs of man are present in the earth which every needy one can obtain. This wide and vast surface of the earth is thebanqueting table (*Maida*)for the numerous and diverse favours of that Allah *Razzaq*which is spread out equally for His creation. The One Who has created creationhas also made arrangements for its *Rizq* Himself:

> It is Allah Who has created you: further, He has provided for your sustenance; then He will cause you to die; and again He will give you life. Are there any of your 'Partners' who can do any single one of these things? ...(30:40)

7.1 *Rizq* from the Heavens and Earth

He has organised the system of the universe in such a way, and it isbusy in carrying out its duties in such a manner, that allthe means and resources of *Rizq*keep appearing before man:

> Who has made the earth your couch, and the heavens your canopy; and sent down rain from the heavens; and brought forth therewith fruits for your sustenance... (2:22)

Accumulating stores of water in the lofty skies and then producing life-giving *Rizq* from the dead landthrough these - these are all the amazing displays of His attribute of *Razzaqi*:

> It is Allah Who has created the heavens and the earth and sends down rain from the skies, and with it brings out fruits wherewith to feed you ...(14:32)

Rain is both a cause for the production of *Rizq*and is *Rizq*in itself because water is an

indispensable part of *Rizq*:

...and the fact that Allah sends down sustenance from the sky, and revives therewith the earth after its death...(45:5)

The initial source of life is also water and the cause for its continuing existence too.The continuous flow of the stream of life is a result of its blessings:

...We made from water every living thing...(21:30) See also (50:9-11)

7.2 System of *Rizq* is in Allah's Hand

This system of *Rizq* is established through the planned execution of the Creator of the heavens and earth and none can dare to deny this fact. Even the materialist who verbally denies the existence of God will also accept this fact that this system is not thehandiwork of man. This is another matter that he will give the name of 'laws of Nature' to this system. But who is going to deny this fact that 'laws' can never beimplemented without the existence of a deciding power with the freedom to choose - this Being is called Allah:

Say: 'Who is it that sustains you (in life) from the sky and from the earth? or Who is it that has power over hearing and sight? And Who is it that brings out the living from the dead and the dead from the living? and Who is it that rules and regulates all affairs?' They will soon say, 'Allah' ...(10:31)

The Quran, with its unique style of reasoning, by presenting the awesome system of the universe to us, directsthe human mind to the Oneness of Allah. This is because the overwhelming wonder of the system of the universe draws man to reach this conclusion that the Will of a Being with freedom to choose and possessing intentis workingbehind this system. And its integrity and harmonypoints to this fact that the Being possessing free will is 'One' and Alone i.e. in the whole of the universe there only one law is in action:

Or, Who originates creation, then repeats it, and Who gives you sustenance from the heaven and the earth? (can there be another) god besides Allah? Say, 'Bring forth your argument, if you are telling the truth!' (27:64)See also(35:3)

7.3 No-one else Possesses Authority over*Rizq*

This was the general aspect of this belief that only Allah provides *Rizq*. Alongside this, the practical aspect of this is also made evident that other than Him no-one else is the

controller of*Rizq*. By combining these two parts the completion of *Eimaan* takes place:

And follow others than Allah, such as have no power of providing them, for sustenance (Rizq), with anything in the heavens or the earth, and cannot possibly have such power? (16:73)

In this short verse the Quran has negated all those 'gods' whose obedience and subjugation is accepted because man (of his own accord) thinks that the provision of*Rizq* is in their control. But the reality is that regardless whether the gods and goddesses are of the era of 'superstition' or are human gods of the era of 'civilisation and enlightenment', *Rizq* is not in anyone's hand, it is only in Allah's hand, and when *Rizq* only comes from His direction, then leaving Him,how can there be slavery and subjugation to someone else?

…The things that you follow besides Allah have no power to give you sustenance: then seek you sustenance from Allah, serve Him, and be grateful to Him: to Him will be your return. (29:17)

If He shuts off the sources of sustenance, then no power can open them:

Or who is there that can provide you with Sustenance if He were to withhold His provision? …(67:21)

Leaving aside the shutting off of all means of sustenance, if there is even the slightest variation in this system e.g. clean and pure water rising from the sea becomes clouds and all its contaminants(which are responsible for its salinity) remain behind in the sea – if any change occurs in this system and the seawater becomes clouds just as it is and in the same format begins to rain upon the earth, just consider how witheven with this minor change what the state of the world will become. Through this balanced system He provides *Rizq* to mankind and desires nothing in return:

…We ask you not to provide sustenance: We provide it for you…(20:132)

This is the distinction between the true Sustainer and 'false gods'.

7.4 Beneficial *Rizq*

All the things which Allah has created as *Rizq*, those are *Tayyab*, pure, beneficial and pleasant,apart fromthe consumption of those which Allah Himself has forbidden. Hence, those things which Allah has declared to be *Halal* and beneficial, no-one has the right to label them as being *Haram* and detrimental:

Say: Who has forbidden the beautiful (gifts) of Allah, which He has produced for His servants, and the things, clean and pure, (which He has provided) for sustenance? … (7:32)

In another verse it is stated that Allah has provided for you*Rizq* of pleasant things (16:72). But those things which He has created as *Halal* and beneficial, pure and useful, man makes them *Haram* and harmful through the intervention of his hands. Some examples of turning these from beneficial to injurious, useful to harmful, are glaringly clear. Water is absolutely life-giving but when it overflows and exceeds limits, then this same water becomes a cause for fatalities. Hence, it is also important tokeep in view the defined scales in the use of everything. Transgressing the limit of these scales is called *Asraaf* (exceeding the limits) which is destructive. The Quran states:

…eat and drink: But waste not by excess…(7:31)

In another verse it is stated that Allah has produced various kinds of fruitsfor you, so eat these fruits, and when you harvest the crop,then from that distribute His share as a right as well. The Quran states:

…But waste not by excess, for Allah loves not the wasters…(7:31)

And do not exceed the limits becauseHe does not like those who exceed limits. This is that breaking of laws, the effects and consequences of which manifest intrinsically very quickly.

7.5 Observing the Divine Limits

But certain situations are such where the consequences and effects of breakingthe laws do not become apparent immediately, and man does not perceive them discernibly. This is that point where the guidance of a visionary is needed. A kidney stone does not form in a day. It is the consequence of months and sometimes years of a gradual imperceptible process. During this time the patient is not even aware that those things which he is consuming considering them to be extremely beneficial, how harmful these are becoming for him. Here a physician is required, who by diagnosing through symptoms and signs,can say which things are harmful for him. That physician will forbidcertain items permanently for him because they do not suit this patient's constitution, and some things he will give permission to be consumed in a specificcombination. For the sake of his health this patient will first of all need to have confidence in the expertise of this physician,after this trust he will need to follow his instructions to the letter. If he does not do this, he will not have the fortune to

at tain good health.

This example is related to physical health. But for man diseases of the physical body are not as harmful as those harmful diseases which result in damage to hisself (personality).Through diseases of the body his current life becomes miserable, but through the second type of diseases both his present life as well as the life to come in the hereafter become a continuous hell. Hence, the Quran which is a complete code for the whole life of man provides full instructions like an expert physician andkinddoctor. In this respect, certain things are such regarding which the Quran states that these are not suitable for the disposition of humanity; this is why the command was given to not even go near them. Some are those about which the Quran states that these things are intrinsically useful and beneficial but the manner in whichthey are utilised results in a difference in their effects.

7.6 Prescribing*Halal* and *Haram*

If we pick fruit from our own orchard and eat it then it is beneficial and *Halal*, but if we steal fruit from the orchard of another and eat it, then that same fruit is *Haram* and harmful i.e. both fruits are of the same kind, their properties are similar, if their constituents are analysed there will be no difference in the composition of both. But due to thedifference in the 'manner of use' there will be the difference of life and death in their result. A materialist cannot comprehend this distinction. He states that the same kind of things can be purchased with the money from a thief as with the money from a labourer. In order to understand this difference (as explained in the first example),it is essential to have conviction in the expertise of the physician and this is what is called *Eimaan*. This is what is absent in the heart of the materialist and its consequence isthat today no 'health' is visible in any aspect of human life. The whole of Europe and as a consequence the whole world is turning into such a hell whose flames are turning humanity into a heap of ash.

It should be made clear that having conviction in the 'expertise of a physician' is initially in the form of '*Eimaan* in the unseen' but after this the results of its treatment will convert this '*Eimaan* in the unseen' into conviction based on evidence.

In any event the Quran, like a compassionate physician,emphasises that whatever is bestowed by Allahas *Rizq*, should be consumed using pure methods and not through *Haram* means i.e. firstly, do not set yourself to make decisions about *Halal* and *Haram*yourself, insteadact according to that same decisionthat your 'expert physician' has made:

> Say: 'See you what things Allah has sent down to you for sustenance? Yet you hold

forbidden (Haram) some things thereof and some lawful (Halal).' Say: 'Has Allah indeed permitted you, or do you invent (things) to attribute to Allah?' (10:59)

There is another point implicit in the consumption in a 'pure manner'of those things which have been declared as *Halal* by Allah. This means that it is not essential that an individual must eat all the *Halal* things of the world. 'Pure' means that which produces pleasant and positive results. Therefore, from these *Halal* things, that thing which someone does not like andis not according to preference or is unsuitable for health, should not be consumed. The difference which is present in not eating something in this wayandin considering something to be *Haram* is obvious.

It has already been stated above that as a result of the method used for obtaining *Rizq*, the nature of *Rizq* and its effectschange. If *Rizq*is obtained through legitimate means then this *Rizq* becomes balanced *Rizq*, pure *Rizq* and honourable *Rizq*. This kind of*Rizq*is the portion belonging to those people who have *Eimaan* in Allah and who make efforts underHis defined laid down laws.

7.7 Honourable (*Kareem*)*Rizq*

The Quran states:

> Those who accept Eimaan and work righteousness, for them is protection and a sustenance most honoured (Kareem). (22:50) See also (8:4, 11:88, 24:26)

The question is, what is it that is known as*Rizq e Kareem* (sustenance with dignity) and how is it obtained? The matter is evidently clear. One society is that in which the means of sustenance are in the grip and control of a few human beings, while the remainder of the population arereliant and dependent on them for their daily bread. They extract work out of these dependent people according to their will; in this way their own dependency forces them intoservitude. It is obvious that self-respect and eminence of humanity cannot endure by obtaining sustenance in this way. This is the bread of humiliation and bondage. Contrary to this, an alternative society is one in whichthe sources of sustenance are not in the ownership of any individual, instead they arethe means to fulfil all the needs of the needy, and the people who organise and manage it, administer it in such a way that no individual remains deprived of his needs. In this, no individual is dependent on any other individual nor is he a servant. In this society every individual receives sustenance with respect and dignity.

The teaching of the Quran is that wherever the*Jamaat e Momineen*may be, theyshould make efforts to establish this kind of Quranic system. If they are successful in this, then that is great. But if they see that the environment there cannot become favourable in any

way at all for this type of society, then they should migrate to such a land which is favourable for such a society (provided that such a land exists somewhere). They are told that they should not give up and by 'cutting off their feet' remainsitting in this unfavourable environment purely under the influence of the fear of dyingfrom hungerif they left this piece of land and moved to another place. They are directed:

O My servants who have Eimaan! truly, spacious is My Earth: therefore, only follow Me! (29:56)

In the terminology of the Quran this is called *Hijrat* (migration). After *Hijrat* the next and final stage is that of *Jihad* and *Qital* (fighting), and it is a fact that among righteous deeds this has the highest status in which a *Momin* presents his greatest and most precious possession, in other words such ashis life, in the establishment and strengthening of the Divinesystem. If the consequence of such a righteous deed is not *Rizq e Kareem* then of what other deed will it be?

Those who have Eimaan, and adopt exile, and fight in the path of Allah as well as those who give (them) asylum and aid, these are (all) in very truth Momineen: for them is the protection and a Kareem Rizq. (8:74) See also (8:26, 10:93)

7.8 Power in the Land and *Rizq* in the Life of the Hereafter

These are those righteous deeds whose consequencesare power and statehood, and *Rizq e Kareem* in this world. The life of success and eminence – that life in which man only bows his head beforethe laws of the One Allah – is the most respectable and steadfast life. However, this *Rizq*does not remain confined to this world only, in the life of the hereafterit is bestowedby Allah as *Rizq eTayyab*.First of all,consider theMujahideen who lay down their life in the cause of Allah. In return for the spilling of their sanctified blood,when their nation gains power in the land and as a consequence obtains*Rizq e Kareem* (honoured sustenance) in this life, these martyrs are gifted *Rizq* from their *Rabb*:

Think not of those who are slain in Allah's way as dead. Nay, they live, finding their sustenance (Rizq) in the presence of their Rabb…(3:169)

Those migrants who lay down their lives in the cause of Allah are also given glad tidings of *Rizq e Hasna*:

Those who leave their homes in the cause of Allah, and are then slain or die, on them will Allah bestow verily a goodly provision: Truly Allah is He Who bestows the best provision. (22:58)

8- مذہب کشمکش حیات سے فرار سکھاتا ہے۔	دین زندگی کے حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے۔
9- مذہب تقدیر کے بہانے انسان کو بے عمل بنا دیتا ہے۔	دین، اسے تقدیر شکن قوت عطا کر کے، حرکت و عمل کا شعلۂ جوالہ بنا دیتا ہے۔
10- مذہب خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات کا نام عبادت رکھ کر انسانوں کو خودفریبی میں مبتلا رکھتا ہے۔	دین، اسے وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل کا پیغام دیتا اور نظامِ خداوندی کو دنیا کے ہر نظامِ باطل پر غالب کرنے کو عبادت کی غایت بتاتا ہے۔
11- مذہب، کائنات کی ہر حسین شے پر منہ بسورنا اور نعمائے خداوندی سے اجتناب سکھاتا ہے۔	دین اعلان کرتا ہے کہ وہ کون ہے جو زیب و زینت کی ان چیزوں کو حرام قرار دے سکتا ہے، جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے (القرآن)۔
12- مذہب ہر جدت (نئی چیز) کو گناہ قرار دینے تک لے جاتا ہے۔	دین کہتا ہے کہ کل یوم ھو فی شان۔ زندگی کے تقاضے ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں اس لئے جدت طرازی عین تقاضائے حیات ہے۔
13- مذہب اپنے پیغام کے حق کی دلیل میں اسے اسلاف کا مسلک قرار دے کر بطور سند پیش کرتا ہے۔ ان کی طرف سے پیش کردہ عقائد پر ایمان بلاعلم و دلیل لانے پر زور دیا جاتا ہے۔	دین انسان کی علمی اور عقلی صلاحیتوں کو جلا دینے کا موجب اور اسلاف کے مسالک کی بلا دلیل پیروی سے منع کرتا ہے۔ وہ اپنے ہر دعویٰ کو دلیل اور برہان سے پیش کرتا ہے اور عقل و تدبر سے کام لینے کی تاکید بھی۔
14- مذہب کا تصور مفاد پرست انسانوں کے ذہن کا تراشیدہ ہے۔ ان میں سبھی ملوکیت (فرعون)، سرمایہ داری (قارون) اور مذہبی پیشوائیت (ہامان) کے نمائندے باہمی اشتراک سے دوسروں کی محنت سے کمائی پر عیش کی زندگی بسر کرنے کے لئے ہر جائز و ناجائز حیلے تراش کر مذہب میں شامل کر لیتے ہیں۔ خود مترفین بن کر دوسروں کو محکوم بنا لیتے ہیں۔	دین مذہب کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسانوں کو آزادی کی دعوت دیتا ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان کو اپنا محکوم اور اطاعت گذار بنائے۔ اطاعت صرف خدا (اس کے قوانین) کی کی جاسکتی ہے اور یہ قانون سب کے لئے برابر ہونے کی وجہ سے تمام نوع انسانی کے لئے مساوات کا پیغام رکھتا ہے۔
15- مذہب اس راستے کو کہتے ہیں جو انسانوں کا وضع کردہ ہو۔	دین اس قانون یا نظام کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملا ہو۔

اس لئے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن نے نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے دین ہی کو پیش کیا ہے اور اسے ہی اسلام کا نام دیا ہے۔ لہٰذا مسلم مذہب کی نہیں دینِ اسلام کی اطاعت کرتا ہے۔

☆☆☆

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.76
ISSUE
05

Monthly **TOLU-E-ISLAM**

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com Web: www.toluislam.org
www.facebook.com/talueislam/ www.youtube.com/idaratolueislam

بندۂ مزدور کو جاکر مرا پیغام دے   خضر کا پیغام کیا، ہے یہ پیامِ کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر   شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات